Regd.L.No.7243 Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1980

مومنانہ فراست :-

از خاک سمرقندے، ترسم کہ دگر خیزد
آشوب ہلاکوئے، ہنگامۂ چنگیزے

(اقبال رحمۃ - پیغام مشرق ص 192 — شائع شدہ 1923ء)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵- بی گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ۔/۳۶ روپے
غیر ممالک ۔/ ۳½ پونڈ

ٹیلیفون نمبر ۸۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

جلد ۳۳ | فروری ۱۹۸۰ | شمارہ ۲

فہرست

۱۔ لمعات ——— (اسلامی نظامِ مملکت) ——— ۲
۲۔ فہرست معطیانِ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ——— ۱۲
۳۔ عطیات کے متعلق ضروری وضاحت اور ہدایات ۔ (شیخ سراج الحق، سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ۱۳
۴۔ سائنٹیفک تحقیق اور اجتہاد ——— (ڈاکٹر عبدالودود صاحب) ——— ۱۴
۵۔ فیصل آباد کا اجتماع ——— ۱۷
۶۔ رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ——— (پرویز صاحب کا درسِ قرآن مجید) ——— ۱۸
۷۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کی رفتار ——— ۳۲
۸۔ قانون کی حکمرانی ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۳۴
۹۔ حقیقت خود کو منوالیتی ہے ——— (اسلام اور فرقہ بندی) ——— ۵۷
——— (خلیفۃ اللہ کا عقیدہ) (بخاری کی ایک حدیث) (طلاق کا مسئلہ) ———
۱۰۔ قرآنی درس کے اعلانات وغیرہ ——— ۶۴

ایڈیٹر۔ محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر۔ شیخ نیاز احمد، مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس، ۱۷ ہسپتال روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(اسلامی نظامِ مملکت)

طلوعِ اسلام میں 'اسلام'، 'اسلامی نظام'، 'اسلامی مملکت' وغیرہ موضوعات پر اس تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے کہ اگر اسے یک جا کر دیا جائے تو اس سے کئی مجلدات مرتب ہو جائیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم سے تقاضا کیا جا رہا ہے کہ ان عنوانات کا ملخص، عام فہم الفاظ میں، مختصر طور پر اس انداز سے لکھ دیا جائے کہ اس اہم ترین موضوع کے تمام گوشے بیک نظر سامنے آ جائیں۔ ان تقاضوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان سوالات کے سلسلہ میں ملک میں اس قسم کی بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں کہ ان سے ذہنوں میں سخت الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ الجھاؤ ہے جسے دور کرنے کے لئے ہم سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان حقائق کو مختصر الفاظ میں پیشِ خدمت قارئین کر دیا جائے تاکہ ان کی یہ خلش دور ہو جائے۔

(۱) اسلام کیا ہے

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اسلام کیا ہے۔ اس لئے کہ جب تک اس سوال کا متعین جواب سامنے نہ آ جائے اسلامی نظام، اسلامی مملکت، اسلامی قوانین وغیرہ سے متعلق کوئی بات سمجھ میں نہیں آ سکے گی۔ قرآن کریم نے اس سوال کا متعین جواب ایک مختصر سی آیت میں یہ کہہ کر دے دیا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ وہ کافر ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے مطابق فیصلے نہ کرنے کو کفر کہا جاتا ہے اور اس کے مطابق فیصلے کرنے کا نام اسلام ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے اعلان کیا تھا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۶/۱۶۴) "میں سب سے پہلا مسلم ہوں" تو اس لئے کہ آپؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸) "تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے اللہ کی کتاب کے مطابق کیا کرو"۔ اور حضورؐ نے لوگوں سے برملا ارشاد فرما دیا کہ

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۵)

کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم تسلیم کر لوں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو

تمام امور کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔ وہ کتاب مفصل ہے۔

مفصل ہونے کے علاوہ اس کتاب کی بنیادی خصوصیات یہ بھی ہیں

(۱) وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ .... (۱۶/۸۹)

(اے رسولؐ) ہم نے تیری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جو (دین سے متعلق) تمام باتوں کو واضح طور پر بیان کر دیتی ہے۔

یعنی قرآن مجید میں جو اصول و اقدار و احکام و قوانین دیئے گئے ہیں ان میں کسی قسم کا ابہام یا الجھاؤ نہیں۔ وہ بالکل واضح ہیں۔

(۲) تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ .... (۶/۱۱۵)

تیرے رب کی باتیں (کلمات) صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئیں۔ اتمام کو پہنچ گئیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔

اس آیۂ جلیلہ میں اسلام کے بنیادی اصول واضح کر دیئے گئے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اسلام کے متعلق جو کچھ خدا نے کہنا تھا وہ سب قرآن مجید میں کہہ دیا گیا ہے۔ وہ اس میں مکمل طور پر دے دیا گیا ہے۔ وہ اس میں اتمام تک پہنچ گیا ہے۔ دین کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں جو اس کتاب مبین میں نہ آ گئی ہو۔ لہٰذا :-

(ا) قرآن مجید ناتمام نہیں کہ کسی اور چیز کے اس کے ساتھ ملنے سے دین مکمل ہو گا۔

(ب) جو بات قرآن کریم میں نہیں، وہ الدین نہیں۔

دوسری بات اس آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ یعنی جو کچھ قرآن مجید میں دیا گیا ہے وہ غیر متبدل ہے۔ اس میں کوئی بھی کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ کسی کو اس کا اختیار نہیں۔ لہٰذا :-

(ج) غیر متبدل دین قرآن مجید کے اندر ہے۔

(د) جو کچھ قرآن مجید کے اندر نہیں، وہ غیر متبدل نہیں۔ اس میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ (اس کی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی کہ وہ کیا ہے جس میں تغیر و تبدّل کیا جا سکتا ہے)

قرآن مجید کی اگلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ ارشاد ہے :-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

یعنی یہ کتاب قیامت تک محفوظ رہے گی۔ بنا بریں جو کتاب (قرآن) امّت کے پاس ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جسے اللہ تعالےٰ نے رسول اللہؐ پر نازل فرمایا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(۱) اسلام نام ہے تمام امور کے فیصلے قرآن مجید کے مطابق کرنے کا۔

(۲) 'الدین یا الاسلام' قرآن مجید کے اندر مکمل طور پر دے دیا گیا ہے۔

(۳) قرآن مجید، مکمل ہونے کے ساتھ غیر متبدل اور محفوظ بھی ہے۔ لہٰذا یہ قیامت تک کے لئے دین کا ضابطہ قرار پانے کا اہل ہے۔

(۲) اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں

اسلامی مملکت وہ ہے جو ایسا نظام قائم کرے جس میں جملہ امور کے فیصلے قرآن مجید کے مطابق ہوں۔ اس سے دین کا تمکن ہوگا جو اسلامی مملکت (استخلاف فی الارض) کی غایت اور وجہِ جواز ہے۔ قرآن مجید میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اسلامی مملکت کا مقصد یہ ہے کہ

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ . . . . (۲۴/۵۵)

تاکہ اس سے اس دین کا تمکن ہو جائے جسے خدا نے ان کے لئے منتخب کیا ہے

الدین کا تمکن اسلامی مملکت کی ذمہ داری اور غایت ہے۔

(۳) یہ مملکت کس کی ہوتی ہے

اسلامی مملکت کسی خاص فرد، گروہ یا جماعت کی نہیں ہوتی۔ یہ پوری اُمت کی ہوتی ہے۔

سورۃ النور کی جس آیت کا ایک حصہ اوپر درج کیا گیا ہے اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۴/۵۵)

خدا نے ان لوگوں سے جو ایمان لائیں اور اعمال صالح کے پیکر ہوں، وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں استخلاف فی الارض عطا کر دے گا۔

لہٰذا، استخلاف فی الارض ایمان اور اعمال صالح کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ مملکت اس امت کو ملتی ہے جو ان اوصاف سے متصف ہو۔

قرآن مجید نے اسلامی حکومت کا فریضہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" قرار دیا ہے یعنی ان امور کا حکم نافذ کرنا جنہیں خدا نے صحیح قرار دیا ہے اور ان سے روکنا جنہیں اس نے غلط کہا ہے۔ اس نے یہ فریضہ پوری کی پوری اُمت کا قرار دیا ہے جہاں کہا ہے کہ

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۳/۱۱۰)

تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

سورۃ الحج میں جملہ مومنین کے متعلق کہا ہے:-

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ . . . . (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیں گے۔

اس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ سورۃ التوبہ میں ہے:-

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ... (۹/۷۱)
مومن مرد اور مومن عورتیں ، سب ایک دوسرے کے دوست ساز گار ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں۔

(۴) اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول

اسلامی مملکت یا اسلامی نظام کے ضمن میں سب سے زیادہ الجھاؤ ، قانون سازی کے سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس گوشہ کا اچھی طرح سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ اس ضمن میں اس بنیادی حقیقت کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم بیشک مکمل ضابطہ حیات ہے لیکن اس نے (بجز چند احکام) دین کے اصول و اقدار دیئے ہیں۔ نہ ان اصولوں کی جزئیات خود مدون کی ہیں اور نہ ہی وہ طریق کار متعین کیا ہے جس سے ان اصول و اقدار کو نافذ کیا جائے گا۔ اسے اس نے اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ انہیں اپنے حالات کے مطابق خود متعین کرے۔ جس ضابطہ حیات کو تمام زمانوں اور تمام اقوام عالم کے لئے غیر متبدل ضابطہ قرار پانا تھا ، اسے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اگر ان جزئیات اور طریق کار کو بھی قرآن کے اندر دے دیا جاتا تو یہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہو جاتے اور ان پر عملدرآمد مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ اصول و اقدار ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار پا سکتے ہیں (بلکہ یوں کہیئے کہ انہیں ہونا ہی ایسا چاہیئے) لیکن ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے طرق و اسالیب تو زمانے کے تقاضوں اور حالات کے تغیرات کے مطابق بدلتے رہنے چاہئیں۔ قرآن کریم کی یہ انتہائی حکمت بالغہ ہے کہ اس نے اسلامی مملکت کے لئے یہی طریق کار تجویز کیا ہے۔ یہی ختم نبوت کا بھی تقاضا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا ہے :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (۵/۱۰۱)

اے جماعت مومنین! جن امور کے متعلق کتاب اللہ خاموش ہے ان کی بابت خواہ مخواہ سوالات نہ کیا کرو۔ ابھی وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہارے سوالات کے جواب میں وحی کے ذریعے مزید احکام دے دیئے گئے تو ان کا نبھانا تمہارے لئے دشوار ہو جائے گا۔

اس کے بعد فرمایا :-

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ (۵/۱۰۲)

اس سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے زندگی کو ناقابل برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا اور جب انہیں نبھا نہ سکے تو (چونکہ وہ دین کی شکل اختیار کر چکی تھیں ان کے لئے) وہ سرے سے دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔

تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش رہتی ہے، یہ نہیں کہ خدا ان کے متعلق (معاذ اللہ) ہدایات دینا بھول گیا ہے۔ قطعاً نہیں۔ اس نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ اس آیہ جلیلہ کی تشریح نبی اکرمؐ نے اپنی ایک حدیث میں یوں فرمادی کہ

اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْھَا ۔ وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَھِکُوْھَا ۔ وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْھَا وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَاءَ مِنْ غَیْرِ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْھَا ۔ اللہ تعالےٰ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے، انہیں ضائع مت کرو (ان کی پابندی کرو) ۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کے پاس تک نہ پھٹکو ۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو ۔ اور دیگر امور کے متعلق دانستہ خاموشی اختیار کی ہے ۔ ان کے متعلق کرید مت کرو ۔ (مشکوٰۃ ۔ کتاب تمسک بالقرآن والسنۃ ۔ اردو ترجمہ ۔ جلد اوّل ۔ صفحہ ۹۳)

(۵) مشاورت

سوال یہ ہے کہ قرآنی اصول و احکام کی یہ جزئیات اور اسلامی حکومت کے قیام کے طرق و اسالیب جنہیں قرآن مجید میں دانستہ نہیں دیا گیا، انہیں کس طرح مرتب کیا جائے گا کیونکہ ان کے بغیر اسلامی مملکت کا قیام ہی ممکن نہیں ۔ قرآن مجید نے بتا دیا ہے کہ ان کا تعین اسلامی مملکت، امت کے باہمی مشورہ سے کرے گی ۔ اس باب میں اس نے سب سے پہلے خود حضور نبی اکرمؐ سے فرمایا: وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (۳/۱۵۹) "معاملاتِ حکومت ان کے مشورے سے طے کیا کرو" اس آیت میں "ھُمْ" (جمع غائب) کی ضمیر واضح کرتی ہے کہ اس مشاورت میں پوری کی پوری اُمت شریک ہوگی ۔ چونکہ اسلامی مملکت کو حضورؐ کے بعد بھی قائم رہنا تھا اس لئے خود امت کے متعلق ارشاد ہوا کہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے امورِ مملکت ان کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے" یہاں بھی اَمْرُھُمْ کی ضمیر نے واضح کر دیا کہ یہ حکومت پوری کی پوری امت کی ہوگی ۔ اور بَیْنَھُمْ کی ضمیر نے بتا دیا کہ اس مشاورت میں پوری امت شریک ہوگی ۔ اس مشاورت کی مشینری کیا ہوگی اور اسے کس طرح متعین کیا جائے گا، قرآن کریم نے ان جزئیات کو بھی خود متعین نہیں کیا ۔ اسے بھی اسلامی مملکت کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق انہیں خود متعین کرے ۔ ان تصریحات سے حسب ذیل نکات واضح ہو جاتے ہیں ۔

(۱) اسلامی مجلسِ مشاورت کے اختیارات غیر محدود نہیں ہوں گے ۔ یہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت کے متعلق فیصلے کرے گی ۔ یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جس سے اسلامی مشاورت، مغربی جمہوریت سے ممیز اور ممتاز ہو جاتی ہے ۔ مغربی جمہوریت میں مجلس قوانین ساز کے اختیارات غیر محدود ہوتے ہیں ۔ اسی کو سیکولر نظام حکومت کہا جاتا ہے ۔

(۲) اسلامی مجلسِ مشاورت نہ قرآنی اصول و اقدار میں اضافہ کر سکے گی اور نہ ہی ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ۔ اضافہ اس لئے نہیں کیا جا سکے گا کہ یہ قرآن کے مکمل ہونے کے دعویٰ کے خلاف ہوگا ۔ اور تغیر و تبدل اس لئے نہیں کیا جا سکے گا کہ یہ قرآن مجید کے دوسرے دعویٰ کے خلاف ہوگا جس میں اس نے کہا ہے کہ کلمات اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا ۔ اس مجلس کا فریضہ قرآنی اصول و اقدار کا نفاذ ہوگا ۔

(۳) اسلامی مجلسِ مشاورت کے فیصلے غیر متبدل نہیں ہوں گے ۔ اس لئے کہ غیر متبدل ہونے کی خصوصیت صرف کتاب اللہ کو حاصل ہے ۔ اگر کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور قانون کو بھی غیر متبدل تسلیم کیا جائے گا تو یہ اس

قانون کو قرآن کی مثل یا اس کا ہمسر قرار دینے کے مرادف ہوگا۔ قرآنی اصول و قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور ان کی حدود کے اندر اسلامی حکومتوں کے فیصلے، قابلِ تغیر و تبدل۔ اگر کسی زمانہ کی اسلامی حکومت کے فیصلوں کو ابدی (یعنی ہمیشہ کے لئے غیر متبدل) قرار دے دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے یہ قوانین، قرآن کے ہم پایہ قرار پا جائیں گے، بلکہ قرآن مجید نے اُمت کو جو مشاورت کا حکم دیا ہے، اس حکومت کے بعد امت کے لئے مشاورت کے دروازے بند ہو جائیں گے اور یہ قرآنی نظام کے صریحاً خلاف ہے۔ قرآن کا مشاورت کا حکم ہمیشہ کارفرما رہنا چاہیئے۔ اسی کو بالفاظ دیگر یوں کہا جائے گا کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اجتہاد حکومت کا فریضہ ہوگا۔ کسی فرد یا گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس اجتہاد کا نتیجہ قانون کی حیثیت اختیار کر لے گا اور قانون سازی اور قانون کے نفاذ کا اختیار صرف مملکت کو ہوگا نہ کہ کسی فرد یا افراد کے گروہ کو۔

ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے یہ ہماری اختراع نہیں۔ متقدمین اور متاخرین کے جلیل القدر ائمہ تفسیر اور مفکرینِ نظامِ مملکت کی بھی یہی رائے ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی کتاب "شاہکارِ رسالت" میں اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ ہم ان میں سے دو ایک درج ذیل کرتے ہیں۔ امام اعظمؒ (ابوحنیفہ) کے مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے :-

> ابوعوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آپ نے بلا ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل یا پھلاری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس کی مدد کو پہنچو ورنہ اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ آپ نے پھر بلا ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا ... اور ختم ہو چکا ہے۔ (بغدادی۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۳۲۹)

بغدادی نے امامِ اعظمؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ

> اگر نبیؐ مجھے پاتے اور میں آپؐ کو پاتا تو آپ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (ایضاً)۔

امام ابنِ قیمؒ نے اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

> اللہ کی شریعت کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ جس طریق سے عدل و انصاف قائم ہو جائے وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا (الطریق الحکمیہ)

اس سوال کے جواب میں کہ کیا رسول اللہؐ کے صادر فرمودہ احکام اُسی زمانے کے لئے تھے یا ہمیشہ کے لئے شاہ ولی اللہؒ (محدث دہلوی) اصولی طور پر لکھتے ہیں :-

> پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم تیار کرتا ہے اور اسے ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور تخمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسان کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا

ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اسی طریق کار کی رو سے اس رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خود بیش مقصود بالذات نہیں ہوتی اس لئے انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (بحوالہ خطبات اقبال؟ خطبہ ششم)

یہ متقدمین کی آراء تھیں۔ ہمارے زمانے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے ان موضوعات پر بڑی کثرت سے لکھا ہے۔ ترجمان القرآن بابت نومبر ۱۹۷۹ء میں ان کی تحریروں کے بعض اہم ملخصات شائع ہوئے ہیں۔ وہ ان میں لکھتے ہیں :-

(۱) اس نظم کے مطابق حاکمیت (SOVEREIGNTY) صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز (LAWGIVER) صرف خدا ہے۔ کوئی انسان خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، بذاتِ خود حکم دینے اور منع کرنے کا حقدار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ کے حکم ہی کا پیرو ہے۔ (ص ۱۱۶)

(۲) وہ قرآنی حدود کے متعلق لکھتے ہیں :-

یہ حدود زندگی کے ہر شعبے میں چند اصول، چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبہ کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ ان کا منشاء یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں۔ ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لئے ضمنی اور فروعی ضوابط (REGULATIONS) بنا سکتے ہو مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں ہے . . . . اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل، ناقابلِ تغیر و تبدل دستور (CONSTITUTION) بنا کر انسان کو دے دیا ہے جو اس کی روحِ آزادی کو سلب اور اس کی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا . . . . یہ حدیں انسان کے لئے زندگی کے سفر کا صحیح رُخ معین کرتی ہیں اور ہر پیچ مقام، ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اس طرف ہے۔ (ص ۱۱۸-۱۱۹)

(۳) طریقِ مشاورت کے متعلق لکھتے ہیں :-

اسلامی مملکت میں صدر کا انتخاب عام لوگوں کی رضامندی پر منحصر ہے . . . . رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی پسند کیسے معلوم کی جائے تو اس کے لئے اسلام میں کوئی خاص طریق کار مقرر نہیں کر دیا گیا۔ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ (ص ۱۲۱)

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ نہ کسی زمانے کی اسلامی حکومت کے وضع کردہ احکام ابدی اور غیر متبدل قرار پا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا طریقِ کار غیر متغیر۔ ہمارے ہاں جس قدر اُلجھنیں پیدا ہو رہی ہیں وہ اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہیں۔ اگر قرآن مجید کے اس اصل الاصول کو بنیاد قرار دے لیا جائے تو نہ اسلامی مملکت اور حکومت کے قیام کے سلسلہ میں کوئی اُلجھاؤ پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ ہی قوانین سازی کے سلسلہ میں کوئی پیچیدگی یا دشواری۔ ہمارے ہاں ساری پیچیدگیاں اور دشواریاں اس لئے پیدا ہو رہی ہیں کہ ہم خارج از قرآن احکام و ضوابط کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ کر، انہیں بعینہٖ اپنے ہاں نافذ کرنا چاہتے ہیں، اور صدرِ اوّل کی اسلامی حکومت کی شکل و صورت کو دائمی تصور کر کے، اس کی ہو بہو حکومت یہاں قائم کرنا چاہتے۔ یہ دونوں تصورات قرآن کریم کی منشاء کے خلاف

بھی ہیں اور ناممکن العمل بھی۔ لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کی عدلیہ بھی اس تحقیق میں مصروف ہے کہ (معلوم کیا جائے کہ) صدرِ اوّل کے نظامِ حکومت کا نقشہ کیا تھا۔ وہ صدرِ اوّل کے نظامِ حکومت کے نقشے کے متعلق تو مصروفِ تحقیق ہیں لیکن انہوں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ صدرِ اوّل میں نظامِ عدل کا نقشہ کیا تھا؟ سوال یہ ہے کہ اگر کسی طور پہ معلوم بھی ہو جائے کہ اس زمانے میں نظامِ عدل کا نقشہ کیا تھا، تو کیا وہی نظام موجودہ زمانے کی ضروریات کو پورا کر سکے گا؟ جہاں تک اُس دور کے نظامِ مملکت کے نقشہ کا تعلق ہے، اس کی تحقیق کا ذریعہ لامحالہ ہماری تاریخ ہے۔ اور ہماری تاریخ میں جو کچھ ملتا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ کسی صورت قابلِ اعتماد قرار نہیں پا سکتا بلکہ ایسا ہے کہ اسے غیروں کے سامنے پیش کرتے وقت ندامت کے مارے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ غیر مسلموں کی طرف سے اسلام کے خلاف جس قدر اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کی بنیاد یہی وضعی روایات اور افسانوی تاریخ ہے۔ گنجائش ہوتی تو ہم اس تفصیل سے پیش کرتے۔ سردست، صرف ایک واقعہ کے متعلق تاریخی بیانات درج کرنے پر کفایت کرتے ہیں۔ (مزید تفصیل پرویز صاحب کی تصنیف شاہکارِ رسالت میں ملے گی)۔ وہ واقعہ ہے نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب سے متعلق۔ (ظاہر ہے کہ ہماری تاریخ میں اس سے زیادہ اہم واقعہ کوئی اور ہو نہیں سکتا)۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی مبسوط تاریخ طبری کی ہے (جو تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی تھی)۔ اس میں تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے انصار کا ایک اجتماع، سقیفہ بنی ساعدہ میں منعقد ہوا جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کے لئے بطور اُمیدوار کھڑا کیا گیا۔ دوسری طرف سے مہاجرین آ گئے اور یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے بالمقابل سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں کی طرف سے جو تقاریر ہوئیں ان کے درج کرنے کی گنجائش نہیں۔ جب لوگ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر رہے تھے، اس وقت کا نقشہ طبری نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

> سابقہ روایت کے سلسلہ سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ اب ہر طرف سے لوگ آ آ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ۔ ان کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا۔ اللہ اُسے ہلاک کرے۔ اس کو قتل کر دو اور خود ان کے سر ہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا۔ چھوڑو! اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا عمرؓ خاموش رہو۔ اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سود مند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا۔ اگر مجھ میں اٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے۔ اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہ مانتے، بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا لے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کو اٹھا کر ان کے گھر میں پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے۔ تم بھی آ کر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی نہ کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کر لوں۔ اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں۔ اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے نہ لڑوں، ہرگز

بیعت نہ کروں گا۔ خدا کی قسم! اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہو جائیں، تب بھی جب تک میں اپنے معاملے کو اپنے رب کے سامنے پیش نہ کر لوں، بیعت نہیں کروں گا۔

تاریخ طبری۔ جلد اول حصہ چہارم۔ اردو ترجمہ۔ شائع کردہ: جامعہ عثمانیہ) بحوالہ شاہکار رسالت صفحہ ۳۹۰

اس سے ایک صفحہ آگے ہے:۔

ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے کہ امارت کے انتخاب کے موقع پر حباب بن المنذرؓ نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا اس کے ہاتھ پہ وار کیا۔ تلوار گر پڑی۔ عمرؓ نے اسے اٹھا لیا۔ اور پھر سعدؓ پر جھپٹے۔ اب سب نے باری باری آکر بیعت کی۔ سعدؓ نے بھی بیعت کی۔ اس وقت عہد جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی۔ ابوبکرؓ اس سے دور رہے۔ جس وقت سعدؓ پر لوگ چڑھ گئے کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا۔ اللہ اسے ہلاک کرے، یہ منافق ہے۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آ گیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ (حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ منتخب ہو لینے پر) دوسرے امیدوار حضرت سعدؓ

نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک حج ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی (طبری صفحہ)

طبری تو تاریخ کی کتاب ہے۔ احادیث کا صحیح ترین مجموعہ بخاری کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک حضرت ابوبکرؓ سے خلافت کی بیعت نہیں کی۔ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد بیعت کی۔ اس لئے کہ (بخاری کے الفاظ میں) جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ (بخاری۔ کتاب المغازی)

ہم پوچھنا چاہتے ہیں ان دانشورانِ قوم سے جو تاریخ کی رو سے صدرِ اوّل کے اسلامی نظام کا نقشہ مرتب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں کہ کیا آپ اپنے ہاں اس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی تصویر تاریخ اور روایات میں پیش کی گئی ہے؟ یاد رکھئے کہ ہماری تاریخ بیشتر وضعی ہے اور قطعاً اس قابل نہیں کہ اسے قابلِ اعتماد قرار دیا جا سکے۔ صدرِ اوّل کے متعلق اس کے وہی حصے قابلِ اعتماد قرار پا سکتے ہیں جو اصولی طور پر قرآن کے مطابق ہوں۔

صدرِ اوّل کے بعد مسلمانوں میں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت (جسے بالفاظِ صحیح قرآنی حکومت کہنا چاہیئے) کہیں قائم نہیں ہوئی۔ حصولِ خطہ پاکستان وہ پہلی کوشش تھی جو اس مقصد کے لئے کی گئی۔ ہمارے راستے میں مشکلات اس لئے حائل ہو رہی ہیں کہ اسلامی مملکت کا جو تصور قرآن کریم نے پیش کیا ہے وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور اس ضمن میں جو کچھ ہمارے سامنے لایا جاتا ہے وہ مسلمانوں کی حکومتوں سے متعلق ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت اسی صورت میں قائم ہو سکیگی جب ہم قرآنی تصریحات کو اس کی بنیاد قرار دیں گے۔

☆

لیکن یہ سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی ایک اہم بات باقی رہ جاتی ہے۔ ہمارے ذہن میں کچھ ایسا ہے کہ جونہی ہم نے اسلامی نظام کے مطابق حکومت قائم کر لی، وہ انسانیت ساز، خوشگوار نتائج خود بخود برآمد ہونے لگ جائیں گے جنہیں قرآن نے

ارضی جنت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تصور صحیح نہیں۔ اسلامی نظام یا اسلامی حکومت ایسا خودکار (GENERATOR) نہیں کہ جونہی ہم نے اسے نصب کرنے کے بعد اس کا بٹن دبایا، اس سے وہ بجلی پیدا ہونا شروع ہو جائے گی جس سے ہماری جامد زندگی کا ہر پرزہ حرکت میں آجائے گا۔ اسلامی نظام ان انسانوں کے ہاتھوں قائم ہوتا اور اپنے نتائج مرتب کرتا ہے جنہیں قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے اور ان کی خصوصیات تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر، یہ نظام خدا کی طرف سے متعین ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ ان خصوصیات کے حامل انسان (مومنین) اس کے ذریعے عالمگیر انسانیت کی منفعت کا سامان مہیا کر سکیں۔ اگر وہ (مومنین کی) جماعت نہیں ہوگی تو اسلامی نظام کو میکانکی طور پر قائم کرنے سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو سکیں گے۔

اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ نے ہاکی کا میدان دیکھا ہے۔ اسے مختلف حدود اور ضوابط کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ میدان مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اسے اس مقصد کے لئے تیار کیا جاتا ہے کہ ہاکی کے کھلاڑی اس کے اندر اپنے جوہروں کی نمود کر سکیں۔ اب آپ ذرا تصور میں لائیے اس قوم کو کہ وہ ہاکی کے میدان کے متعلق بحث و تمحیص میں تو مصروف رہے کہ اس کی فلاں لائن کتنی لمبی ہونی چاہیئے اور فلاں زاویہ کس درجے کا۔ اس کی (D) کی پیمائش کیا ہو اور گول کی وسعت کس قدر۔ وہ ان تفصیلات کے طے کرنے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دے اور اس میں نوبت جھگڑے اور فسادات تک بھی آجائے، لیکن ہاکی کے کھلاڑی تیار کرنے کا کوئی خیال نہ کرے سوچئے کہ اگر ان کا ہاکی کا میدان ہاکی کے قواعد و ضوابط کے مطابق تیار بھی ہو جائے تو اس سے انہیں فائدہ کیا حاصل ہوگا؟

سو جو قوم اسلامی نظام کی جزئیات و تفصیلات کے متعلق الجھتی رہے لیکن ان افراد کو تیار کرنے کی کوئی فکر نہ کرے جنہوں نے اس نظام کو قائم کرنا، چلانا اور اس سے انسانیت ساز نتائج برآمد کرنا ہے، اس کی مثال اس قوم کی سی ہے جو دن رات ہاکی کا میدان تیار کرنے کی کوششوں میں لگی رہے اور ان کے ہاں ہاکی کی ٹیم ایک بھی نہ ہو۔ یاد رکھیئے! قرآن نے جب یہ نظام عطا کیا تھا تو سب سے پہلے وہ قوم تیار کی تھی جس نے اس نظام کو چلانا تھا۔ كَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا ... (۲/۱۴۳)۔ "اس طرح ہم نے تمہیں بہترین اُمت بنایا"۔ یہ بہترین امت ان افراد پر مشتمل تھی جنہیں قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ نہ کوئی شخص عہد رسالتمآب میں پیدائشی مومن ہوتا تھا، نہ اب مومن پیدا ہوتا ہے۔ مومن بنتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ مومن بنایا جاتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے جس طریق سے مومن بنائے تھے اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ "وہ انہیں کتاب اللہ کی تعلیم اس طرح دیتا تھا کہ اس کے مقاصد اور مصالح عقل و بصیرت کی رو سے ان کے ذہن نشین ہو جائیں۔ وَيُزَكِّيهِمْ۔ اور اس طرح مناسب تربیت اور ماحول سے ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا تھا۔ اس معلّم کی پاکیزہ سیرت اور بلند اخلاق بطور نمونہ (اسوۂ حسنہ) ان کے سامنے تھے۔ وہ اس طرح اس قابل ہو گئے تھے کہ اس نظام کے مطلوبہ نتائج برآمد کر سکیں۔

یہ تھا، مناسب تعلیم و تربیت کے ذریعے، ہماری نئی نسل کے قلب و دماغ کو مومنانہ قالب میں ڈھالنے کا وہ طریق جسے طلوعِ اسلام، تشکیل پاکستان کے روزِ اوّل سے قوم کے سامنے پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ اگر قوم اس طرف توجہ دیتی تو یہاں صحیح اسلامی نظام کبھی کا قائم ہو چکا ہوتا۔ لیکن اب بھی قوم ہاکی کی ٹیم تیار کرنے کے بجائے ہاکی کے میدان کا طول و عرض متعین کرنے کی بحثوں میں مصروفِ جہاد ہے۔ اس سے جو نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔

تعلیمِ کتاب و حکمت اور تزکیۂ سیرت و اخلاق سے "مومن سازی"۔ یہ ہے اسلامی مملکت کے قیام کی اوّلیں اور لاینفک شرط۔

****

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۱۲ دسمبر ۱۹۷۹ء سے ۱۳ جنوری ۱۹۸۰ء تک وصول ہونے والے عطیات)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر	اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
۱۔ محترم ایس اے قدیر صاحب کراچی	۵۰۰۰/- روپے	۲۱۹۰/۵۰	۲۰۔ محترمہ بیگم اختر کرامت علی صاحبہ (بدست محترمہ	۲۵۰۰/- روپے	۲۲۰۹
۲۔ محترم حبیب الزمان قاضی صاحب کراچی	۱۰۱/- ؍؍	۲۱۹۱	بیگم ممتاز جہاں قریشی) لاہور		
۳۔ محترم ڈاکٹر عزیز بخش صاحب چک نمبر ۱۹۷ ج ب فیصل آباد	۲۰۰۰/- ؍؍	۲۱۹۲	۲۱۔ محترم حکیم محبوب عالم خاں صاحب۔ سرگودھا	۱۰۰/- روپے	۲۲۱۰
۴۔ محترم لیکو خان صاحب۔ مردان	۱۰۰/- ؍؍	۲۱۹۳	۲۲۔ محترم میاں خلیل الرحمن صاحب۔ لاہور	۵/- ؍؍	۲۲۱۱
۵۔ محترم طاہر ابرار انصاری صاحب معرفت کراچی بزم	۲۰۰/- ؍؍	۲۱۹۴	۲۳۔ محترم ڈاکٹر محمد صادق صاحب۔ کراچی	۲۰۰/- ؍؍	۲۲۱۲
۶۔ میسرز پاپولر انجینئرنگ اینڈ فاؤنڈری ورکس	۱۰۰۰/- ؍؍	۲۱۹۵	۲۴۔ محترمہ بیگم ظفر سعید صاحبہ۔ راولپنڈی	۴۰۰/- ؍؍	۲۲۱۳
معرفت کراچی بزم			۲۵۔ احباب جھنگ ضلع کونسل (معرفت محترم فضل قیوم صاحب)	۲۲۷۵/- ؍؍	۲۲۱۴
۷۔ معطی اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ گوجرہ	۱۲۰۰/- ؍؍	۲۱۹۶	۲۶۔ احباب بزم کویت (معرفت محترم محمد عمر دراز خان صاحب)	۳۰۰۰/- ؍؍	۲۲۱۵
۸۔ محترم میر سلیمان ملک صاحب۔ قطر	۱۰۰۰/- ؍؍	۲۱۹۷	۲۷۔ محترم محمد نیاز صاحب برائے حاجی غلام محمد مرحوم و بیگم غلام محمد مرحومہ راولپنڈی	۱۱۰۰۰/- ؍؍	۲۲۱۶
۹۔ محترم ڈاکٹر رشید ارشد صاحب مریدکے	۵۰۰/- ؍؍	۲۱۹۸	۲۸۔ محترم عنایت اللہ صاحب۔ دیپالپور خورد بستی	۲۰۰۰/- ؍؍	۲۲۱۷
۱۰۔ محترم عطاء اللہ صاحب۔ لاہور	۵۰/- ؍؍	۲۱۹۹	۲۹۔ احباب دوبئی (معرفت محترم عبدالرؤف صاحب)	۳۵۱۵/- ؍؍	۲۲۱۸
۱۱۔ محترم محمد عالم صاحب۔ دوحہ (قطر)	۱۰۰/- ؍؍	۲۲۰۰	۳۰۔ محترم بشیر احمد خان صاحب۔ شفیلڈ۔ انگلینڈ	۱۱۰۱۰/- ؍؍	۲۲۱۹
۱۲۔ محترم حاجی ملک میاں محمد صاحب۔ پنڈی قتحال	۵۰۰/- ؍؍	۲۲۰۱/۵۹	۳۱۔ محترمہ مس آمنہ خلیل صاحبہ۔ بحرین	۲۴۴/- ؍؍	۲۲۲۰
۱۳۔ محترم لیفٹیننٹ کرنل بشیر احمد صاحب۔ راولپنڈی	۱۰۰/- ؍؍	۲۲۰۲	۳۲۔ معطی اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ کویت	۵۰۰۰/- ؍؍	۲۲۲۱
۱۴۔ محترمہ مسز کوکب ملک صاحبہ۔ لاہور	۱۰،۰۰۰/- ؍؍	۲۲۰۳	۳۳۔ محترمہ بیگم چوہدری عبدالکریم صاحب۔ ننکانہ صاحب	۵۰/- ؍؍	۲۲۲۲
۱۵۔ محترم ملک حنیف جیلانی صاحب۔ مری	۱۰۰/- ؍؍	۲۲۰۴	۳۴۔ محترم محمد رمضان صاحب۔ ڈیرہ غازیخان	۲۰۰/- ؍؍	۲۲۲۳
۱۶۔ محترم علی شیر چشتی صاحب برائے چوہدری	۱۰۰/- ؍؍	۲۲۰۵	۳۵۔ محترم عبدالحئی صاحب۔ لوپوالہ	۵۰۰/- ؍؍	۲۲۲۴
اللہ دتہ مرحوم بہاولپور			۳۶۔ محترم اسلم حیات ملک صاحب۔ بھچرشان	۱۰/- ؍؍	۲۲۲۵
۱۷۔ محترم اسلم حیات صاحب (معرفت محترمہ بیگم مشرف صاحبہ) لاہور	۱۰۰۰/- ؍؍	۲۲۰۶	۳۷۔ محترم محمد ارشاد صاحب۔ چاریان، مری	۲۵/- ؍؍	۲۲۲۶
۱۸۔ احباب بزم کویت (بوساطت محترم محمد عمر دراز خان صاحب)	۳۰۰۰/- ؍؍	۲۲۰۷	۳۸۔ محترم اشرف سرمدی صاحب۔ کراچی	۱۰۰۰/- ؍؍	۲۲۲۷
۱۹۔ محترم محمد عمر دراز خان صاحب۔ کویت	۵۰۰۰/- ؍؍	۲۲۰۸	۳۹۔ محترم ایم طفیل صاحب۔ پیرس	۵۰۰/- ؍؍	۲۲۲۸

میزان = ۷۴۵۸۵/- روپے

میزان سابقہ فہرست = ۶۲۰۳۵/- روپے

میزان کل = ۱،۳۶،۶۲۰/- روپے

عطیات کے متعلق ضروری وضاحت اور ہدایات

(۱) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی اپیل پر احباب نے جس گرمجوشی سے لبیک کہا ہے اور جس فراخدلی سے عطیات سے نوازا ہے اس کے لئے سوسائٹی کے اراکین بالعموم اور اس کے صدر اور سیکرٹری بالخصوص ان کے شکر گزار ہیں۔

(۲) چونکہ تعمیر کے کام کے عنقریب شروع ہو جانے کا امکان ہے اس لئے جن احباب نے ابھی تک عطیات نہیں بھیجے ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ مزید توقف نہ فرمائیں اور جلد از جلد اپنے عطیات ارسال فرمائیں۔

(۳) چونکہ تعمیر کے اخراجات میں سے حد اضافہ ہو گیا ہے اس لئے معطی حضرات اسی نسبت سے اپنے عطیات میں بھی اضافہ فرمائیں تاکہ تعمیر کے کام میں رکاوٹ پیش نہ آئے۔

(۴) جو احباب یا تنظیمات مقررہ طور پر کمرے یا ہال کی تعمیر کے اخراجات برداشت کریں گے ان کے نام کا کتبہ متعلقہ عمارت میں نصب کر دیا جائے گا۔

(۵) بعض احباب نے اپنے عطیات "ادارہ طلوعِ اسلام" کے نام بھیجے ہیں یا اس طرح کہ ان میں سے کچھ قم ادارے کے لئے تھی اور کچھ قرآنک سوسائٹی کے لئے۔ یہ طریق صحیح نہیں "ادارہ طلوعِ اسلام" کا اپنا الگ حساب ہے۔ اور اس قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے حساب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے سوسائٹی کے لئے عطیات بالکل الگ بھیجے جائیں۔

(۶) تمام چیک اس طرح کاٹے جائیں:- QURANIC EDUCATION SOCIETY (REGD), ACCOUNT NO. S.B. 6239

(۷) ڈرافٹ بھی اسی طرح بنوائے جائیں اور وہ HABIB BANK LTD MAIN MARKET BRANCH, GULBERG LAHORE کے نام ہوں۔

(۸) جہاں کسی بینک کی پابندی کی وجہ سے چیک یا ڈرافٹ پر نام لکھنا ضروری ہو تو اسے یوں لکھیں۔

M.M. KHALIL, TREASURER, QURANIC EDUCATION SOCIETY.

(۹) تمام چیک یا ڈرافٹ کراسڈ ہونے چاہئیں۔ (۱۰) چیک یا ڈرافٹ حسب ذیل پتے پر بھیجے جائیں:-

M.M. KHALIL, TREASURER, QURANIC EDUCATION SOCIETY 25-B, GULBERG II LAHORE

(۱۱) منی آرڈر اس طرح لکھے جائیں:-

M.M. KHALIL
TREASURER, QURANIC EDUCATION SOCIETY
25-B, GULBERG II, LAHORE.

منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نام اور پورا پتہ صاف صاف لکھیئے۔

(۱۲) سوسائٹی نے عطیات وصول کرنے کے لئے اپنا کوئی نمائندہ مقرر نہیں کیا البتہ بعض بیرونی ممالک میں قابلِ اعتماد احباب سے گزارش کی ہے کہ وہ مقامی طور پر سوسائٹی کے لئے عطیات وصول اور جمع کریں۔ یہ احباب معطیان کو اپنی طرف سے سادہ سی رسید دے دیں گے اور جمع شدہ عطیات بمع فہرست معطیان سوسائٹی کو بھیج دیں گے۔ سوسائٹی ان معطیان کے نام الگ الگ رسیدیں جاری کرے گی۔ اور انہیں جمع کرنے والے صاحب کو بھیج دے گی۔ سردست حسب ذیل احباب کو عطیات جمع کرنے کے لئے کہا گیا ہے:-

1. MR. MUHAMMED OMER PARAZ KHAN P.O. Box 528 SAFAT, KUWAIT TEL 717250
2. MR. M.H. KIYANI, 203 BYROM AVE, MANOR PARK LONDON E12 6NJ U.K.
3. MR. MUHAMMAD KHALID GUL. SERVICE MANAGER P.O.BOX 1058 ALKHOBAR S/ARABIA

پاکستان میں مختلف شہروں میں طلوعِ اسلام کی بزمیں قائم ہیں ان مقامات میں ان بزموں کے نمائندگان متذکرہ بالا طریق کے مطابق عطیات جمع کرنے کا فریضہ ادا کریں گے۔

والسلام

ممنونِ احسان اور مزید عطیات کا منتظر
(شیخ سراج الحق) سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ

سائنٹفک تحقیق اور اجتہاد

(قرآن مجید نے مومنین کی خصوصیات کے ضمن میں کہا ہے کہ یہ وہ صاحبان عقل و بصیرت (اُولِی الْاَلْبَاب) ہیں یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ ۔ جو زندگی کے ہر پہلو میں قوانین خداوندی کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۱۹۰-۱۹۱) "اور تخلیق ارض و سما میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں"۔ مقام فخر و مسرت ہے کہ ہمارے ارباب علم میں ایک ہستی ایسی ہے جسے مبداء فیض نے ان مومنانہ خصوصیات سے نوازا ہے۔ ان کے سینے میں قلب سلیم تابندہ ہے اور دماغ میں شمع بصیرت روشن۔ وہ ایک طرف آیات قرآنی پر مصروف غور و فکر رہتے ہیں اور دوسری طرف کارگہ کائنات پر مشغول تحقیق و تدقیق۔ اس کا اوّلین ثمر ان کی مایۂ ناز تصنیف (PHENOMENA OF NATURE AND THE QURAN) ہے جو مغربی ارباب فکر و تحقیق تک سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ ہیں ڈاکٹر عبدالودود صاحب۔

سائنس کی تحقیق اوّلیں قدم پر ہی یقین کے درجے تک نہیں پہنچ جاتی۔ اس میں مسلسل مشاہدات و تجربات بھی ہوتے رہتے ہیں اور مزید غور و تفکر بھی۔ اس طرح اس تحقیق کے اسقام و اغلاط کی تصحیح ہوتی رہتی ہے۔ یہی وہ انداز اجتہاد ہے جسے قرآن کریم بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔ جو لوگ تلاش حقیقت میں مصروف جد و جہد رہتے ہیں (مسلسل اجتہاد کرتے رہتے ہیں) ہم ان کے سامنے حقیقت تک پہنچنے کی راہیں کشادہ کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی تحقیق کے سابقہ سقم کو تسلیم اور اس کی اصلاح کرنے کے لئے بڑی کشادہ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صحیح معنوں میں سائنسدان وہی ہے جس میں اس قسم کی صلاحیت موجود ہو۔ اسی قسم کے سائنسدان تھے جن کی کشادہ نگہی کے طفیل، سائنٹفک تحقیقات یقین کے درجے تک پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب کو فطرت نے اس قسم کی کشادہ نگہی بھی عطا کی ہے جس کی ایک شہادت ان کا ذیل کا مختصر سا مقالہ ہے جسے ہم بمسرت شائع کرتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ قرآن اور سائنس سے دلچسپی رکھنے والے ارباب علم اسے مفید پائیں گے۔ (طلوع اسلام)

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ اپنے مطالب خود واضح کرتا ہے۔ جوں جوں انسان غور کرتا ہے مطالب خود بخود نکھر کر سامنے آتے جاتے ہیں۔ اس وقت میرے زیر نظر "سماء الدنیا" اور "کوکب" کے الفاظ ہیں۔ مندرجہ ذیل دو آیات میں سماء

کا لفظ آتا ہے: اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۔ ۔ ۔ (۲:۲۲) اور وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظًا ۔ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۴۱:۱۲) میں نے اپنی کتاب (PHENOMENA OF NATURE AND THE QURAN) میں سماء الدنیا سے مراد وہ آسمان لیا تھا جہاں تک انسان کی نگاہ پہنچتی ہے۔ میری اس فکر کی بنیاد یہ تھی کہ آیت (۲:۲۲) میں سمآء سے مراد وہ آسمان ہے جہاں سے پانی برستا ہے۔ اسے سائنس کی اصطلاح میں (TROPHOSPHERE) کہتے ہیں جو سطح زمین سے سات میل اوپر تک جاتا ہے۔ دوسری طرف آیت (۴۱:۱۲) میں سماء الدنیا سے وہ آسمان مراد ہے جہاں ستارے موجود ہیں جو سطح زمین سے اربوں میل دور ہیں۔ گویا جہاں تک انسان کی نگاہ جاتی ہے یہ سماء الدنیا ہے۔ اب اس کے بعد آیت (۶-۷ : ۳۷) پر نگاہ ڈالئے: اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ نِ الْکَوَاکِبِ وَحِفْظًا مِّنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ (۳۷:۶،۷) اس آیت میں مصابیح کی بجائے لفظ کواکب آیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مصابیح اور کواکب کے الفاظ ہم معنی ہیں اور کیا دونوں سے مراد ستارے ہیں؟ کوکب (جمع کواکب) سے عام مراد ستارے ہی لیا جاتا ہے اور میں بھی اس سے یہی معنی اخذ کرتا رہا ہوں۔ لیکن ڈاکٹر (MAURICL BUCAILLE) نے اپنی کتاب (THE BIBLE, THE QURAN AND SCIENCE) میں ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ انہوں نے کوکب سے مراد (ستارہ نہیں) (PLANET) لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا نکتہ نظر درست ہے۔ میری نگاہ وہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ انہوں نے کوکب کے معنی (PLANET) آیت (۳۵ : ۲۴) کی بنا پر لئے ہیں۔ "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ" (۲۴:۳۵) اس آیت میں مصباح اور کوکب دونوں الفاظ آئے ہیں۔ (مصباح) چراغ (زجاجة) شیشے کے اندر بند ہے اور شیشے کی (REFLECTED LIGHT) کی وجہ سے نور میں اس قدر شدت پیدا ہو گئی ہے کہ "نور علیٰ نور" ہو گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ (REFLECTED) روشنی (PLANET) کی ہوتی ہے۔ ستارے کی روشنی صرف (REFLECED LIGHT) نہیں ہوتی۔ ستارہ اپنی روشنی خود پیدا کرتا ہے۔ (MARMADUK PICKTHAL) نے بھی کوکب کا ترجمہ (PLANET) کیا ہے[۱] لیکن جب تک واضح نہ کیا جائے کہ ستارے اور (PLANET) کی روشنی میں فرق کیا ہے بات سمجھ میں نہیں آتی۔

چنانچہ اگر کوکب کے معنی (PLANET) ہیں تو پھر مجھے سماء الدنیا کا مفہوم بھی بدلنا پڑے گا۔ اس لحاظ سے سماء الدنیا وہ آسمان نہیں جہاں تک ہماری نگاہ جاتی ہے اور جہاں ستارے موجود ہیں بلکہ وہی نزدیک کا آسمان ہے جس میں زمین پر زندگی کے لئے سامانِ حفاظت بھی موجود ہے اور جس کے اندر (PLANETS) بھی موجود ہیں۔ سامانِ حفاظت سماء الدنیا کے اس حصے میں موجود ہے جسے ہم زمین کا (ATMOSPHERE) کہتے ہیں۔ (ATMOSPHERE) زمین کی سطح سے ایک ہزار (۱۰۰۰) میل اوپر تک جاتا ہے۔ اس کا وہ حصہ جس سے پانی برستا ہے (TROPHOSPHERE

---

[۱] مصر کے ڈاکٹر محمد احمد الغمراوی (مرحوم) نے اس بحث کو اپنی کتاب (ISLAM IN THE SCIENTIFIC ERA) میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔
مارماڈیوک پکتھال نے اپنے ترجمہ قرآن میں لکھا ہے کہ انہوں نے مصر میں ڈاکٹر الغمراوی سے کافی استفادہ کیا تھا۔ (طلوع اسلام)

زمین سے سات میل دور ہے اور جو ہوا کی (CONVECTION CURRENTS) کی وجہ سے زمین کی سطح پر درجہ حرارت کو اعتدال پر رکھتا ہے جس کے بغیر زندگی قائم نہیں رہ سکتی اس کے اوپر (STRATOSPHERE) ۱۷ میل تک (CHEMO SPHERE) ۴۵ میل تک اور (INOSPHERE) ۲۵۰ میل زمین سے اوپر تک جاتے ہیں۔ یہ حصے خلا میں سے زمین پر مار کرنے والی خطرناک (RADIATION WAVES) شعاعوں کو اور اوپر سے گرنے والے ذرات (METEORS) کو سطح زمین تک پہنچنے سے روکتے ہیں (تفصیل کے لئے میری کتاب صفحہ ۲۲-۲۱ ملاحظہ فرمایئے)۔

(PLANETS) میں سے سورج سے نزدیک ترین (MERCURY) ہے جو کہ ۳۶ ملین میل کے فاصلہ پر ہے اور اور سب سے دور (PLUTO) ہے جو ۳۶۶۶ ملین میل دور ہے۔ گو یہ فاصلے بھی عام نکتہ نظر سے بہت دور معلوم ہوتے ہیں لیکن زمین سے یا سورج سے ستاروں کے جو فاصلے ہیں ان کی نسبت سے یہ فاصلے کوئی حقیقت نہیں رکھتے مثلاً (PROXIMA CENTAURI) زمین سے نزدیک ترین ستاروں میں شمار ہوتا ہے اور اس کا فاصلہ زمین سے ۴½ (LIGHT YEARS) ہے (لائٹ ائیر سے کیا مراد ہے؟ روشنی کی شعاع ایک سیکنڈ میں ۱۸۰،۰۰۰ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے اور ایک سال میں جس قدر فاصلہ طے کرتی ہے اسے (LIGHT YEAR) کہتے ہیں) اب دیکھئے کہ وہ ستارہ جو سب سے زیادہ دور ہے اور جو آج تک (ASTRONOMY) والے دریافت کر سکے ہیں وہ یہاں سے ۶۰۰۰ ملین (LIGHT-YEARS) دور ہے (گویا لائٹ ائیر کی اصطلاح کے بغیر اسے ہندسوں میں لکھنا بھی مشکل ہے) اکثر ستارے جن کی روشنی آج ہماری آنکھوں تک پہنچتی ہے یہ ان ستاروں سے اس وقت روانہ ہوئی تھی جب ابھی زمین معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ چنانچہ جہاں تک ہمارے زیر نظر موضوع کا تعلق ہے 'سماء الدنیا' سے مراد وہی نزدیک کا آسمان ہے جس میں سامانِ حفاظت بھی ہے اور (PLANETS) بھی ہیں۔ ستاروں والا آسمان بہت دور ہے۔ مصابح کے معنی چراغ ہیں چراغ کا لفظ عام معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے ستاروں کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور (PLANETS) کے لئے بھی۔ چنانچہ لفظ مصابیح آیت (۴۱ : ۱۲) اور لفظ کواکب آیت (۳۷ : ۶) میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ دونوں آیات میں مصابیح اور کواکب سے مراد (PLANETS) ہی ہیں ستارے نہیں ہیں۔

ضمناً آیت ہذا میں جو کوکب کا لفظ آیا ہے (اور راغب کے حوالے سے جس کے معنی ظاہر ہونے اور چھپنے والا ستارہ بیان کئے گئے ہیں) جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سے مراد کوئی خاص ستارہ نہیں کیونکہ ستارہ ہو یا (PLANET) ظاہر ہونے اور (آفل) چھپنے کا عمل ہر ایک کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ ظاہر اور چھپنے والے خاص کرّوں کو (COMETS) کہتے ہیں جن کا (ORBIT) دائرہ حرکت، گول ہونے کے بجائے (ELIPTICAL) ہوتا ہے۔ یہ کرّے (SOLAR SYSTEM) میں شامل ہیں۔ قرآن نے اسے الجوار الکنس کہا ہے۔ آلْ اس کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے اور بغیر روک ٹوک کے ان کی حرکت بھی جاری رہتی ہے اور لمبی مدت کے لئے یہ غائب بھی ہو جاتا ہے (HALLEY'S COMET) سورج کے گرد اپنا چکر ۷۶ سال میں پورا کرتا ہے اور اب ۱۹۸۶ء میں ظاہر ہونے والا ہے۔

فیصل آباد کا اجتماع

ادارہ طلوعِ اسلام، سال میں جو چند تقاریب مناتا ہے ان میں قائدِ اعظمؒ کا یومِ پیدائش (۲۵ دسمبر) بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال اس تقریب کے منانے کی سعادت بزمِ طلوعِ اسلام فیصل آباد کے حصّے میں آئی۔ اس نے اجتماع کا اہتمام، جناح ہال میں کیا اور اجلاس کا وقت، صبح دس بجے۔ اس تقریب میں شرکت کے لئے لاہور سے، مفکرِ قرآن پرویز صاحب اور ان کے رفقاء، بزم کے نمائندہ، اور وہاں کے مشہور اور ہر دلعزیز سرجن، محترم ڈاکٹر محمد حیات ملک کی پُرخلوص میزبانی سے لطف اندوز ہونے کے لئے ۲۴ دسمبر کی شام فیصل آباد پہنچ گئے۔ تحریک سے روشناس اور متفق احباب میں سے بعض پہلے ہی سے وہاں پرویز صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ باقی بعد میں آتے گئے اور اس طرح فکرِ قرآنی کی شمعیں وہیں روشن ہوتی چلی گئیں۔ جن احباب کو پرویز صاحب کی اس قسم کی غیر رسمی اور بلا تکلف محفلوں میں شرکت کا موقع ملا ہے انہیں معلوم ہے کہ یہ محفلیں، ایک طرف کس قدر معلومات افزا اور حقائق پرور، اور دوسری طرف کیسی شگفتہ، شاداب اور دلآویز ہوتی ہیں۔ گہری شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

دوسری صبح، اجلاس کے متعینہ وقت سے پہلے ہی ہال خاصا بھر گیا تھا۔ جلسہ کی صدارت، محترم ڈاکٹر صاحب نے فرمائی۔ تلاوتِ قرآنِ مجید کے بعد کلامِ اقبالؒ کا اعلان ہوا تو ایک عجیب حیرت افزا منظر سامنے آیا۔ ایک قاری (جن کا نام ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس وقت بھول رہے ہیں) سامنے آئے۔ عمر تو خاصی لیکن قد اتنا چھوٹا کہ انہیں اٹھا کر مائک کے سامنے بٹھانا پڑا۔ تو آمدہ احباب منتظر تھے کہ کلامِ اقبالؒ کس سے پیش کرایا جا رہا ہے؟ لیکن قاری صاحب نے حضرت علامہؒ کی حرارت افروز غزل ـــــ لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی ـــــ کا پہلا مصرعہ ہی اٹھایا تو ہال نہ صرف گونج اٹھا، بلکہ وجد میں آگیا۔ اس نشیدِ پُرسوز نے محفل کو گرما بھی دیا اور رُلا بھی دیا۔

پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا ـــ عظمتِ کردار کا گوہرِ تابدار ـــ ان کے خطابات کس قدر معلومات افزا ہوتے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تیس برس سے پاکستان میں اپنے ولولہ انگیز خطابات پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن قائدِ اعظمؒ کے سلسلہ میں ان کے ذاتی مشاہدات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان میں قریب دس سال تک قائدِ اعظمؒ کی معیت میں اپنے انداز سے نہایت مؤثر حصّہ لیا اور اس طرح انہیں قائدِ اعظمؒ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس قرب کے متعلق انہوں نے کہا کہ اکثر احباب کے لئے یہ امر باعثِ تعجب ہوتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے ساتھ میرے ان تعلقات کی بنیاد کیا تھی؟ ان کے الفاظ میں "میں نہ کوئی لیڈر تھا۔ نہ ویسے ہی کوئی بڑا آدمی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کا ایک ملازم۔ اس ذرّۂ ناچیز کو اس آفتابِ فلک پیما سے نسبت کیا؟" ـــ انہوں نے کہا کہ ان کے اس قابلِ رشک قرب کی وجہ قائدِ اعظمؒ کا ذوقِ قرآنی تھا۔ انہیں قرآنی پیغام و نظام سے قلبی لگاؤ تھا۔ اور یہی اس قرب کی بنیاد تھی۔ قائدِ اعظمؒ کا روحِ پرور ذکر، اور پرویز صاحب کا بیان! دو گھنٹے، چند لمحوں کی طرح گذر گئے۔ اور یہ سادہ و حسین محفل نہایت سنجیدگی اور متانت سے اختتام پذیر ہو گئی۔

ادارہ طلوعِ اسلام، بزمِ طلوعِ اسلام، فیصل آباد اور اس کے واجب الاحترام نمائندہ کی خدمت میں اس کامیاب اہتمام کے لئے ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریبِ سعید جشنِ میلاد النبیؐ

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

(پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ مجید)

برادرانِ عزیز! دنیا کی کسی قوم کو لیجئے۔ اس نے سال میں کچھ دن ایسے تجویز کر رکھے ہوں گے جنہیں وہ بطور قومی تیوہار منائے گی۔ قومی زندگی میں تیوہاروں کی تقریبات ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں تیوہار درحقیقت کسی قوم کے اجتماعی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور اظہارِ جذبات (بشرطیکہ وہ آئین و ضوابط اور سنجیدگی و شرافت کی حدود سے تجاوز نہ کرے) انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

تیوہار عام طور پر کسی اہم واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ جس واقعہ کی یاد میں کوئی قوم اپنا تیوہار مناتی ہے اس سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے نزدیک زندگی کے مختلف عناصر کی اہمیت کا معیار کیا ہے مثلاً ہندوستان کی ابتدائی آریہ قوم زراعت پیشہ تھی۔ اس لئے انہوں نے جہاں گنگا جمنا جیسے دریاؤں، بڑ اور پیپل جیسے درختوں کو اپنا دیوتا اور زمین (دھرتی) کو ماتا بنایا وہاں موسموں کے تغیرّات کے اوقات (بسنت، ہولی وغیرہ) کو قومی تیوہار قرار دے لیا۔ اسلامی زندگی میں سب سے بلند اور عظیم مقام قرآنِ کریم کو حاصل ہے۔ اس لئے ان کے ہاں نزولِ قرآن سے زیادہ اہم واقعہ اور کونسا ہو سکتا تھا جسے مّلی تیوہار کی حیثیت حاصل ہوتی۔ اس ضمن میں خود اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۵۸/۱۰) "ان سے کہہ دو کہ (قرآن کا ملنا) اللہ کے فضل اور رحمت سے ہے۔ انہیں چاہیئے کہ اس پر خوشیاں منائیں۔ یہ ہر اس شے سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کرتے ہیں۔

قرآن اور صاحبِ قرآنؐ کا تعلق

لیکن قرآنِ کریم کے بسیط حقائق (ABSTRACT REALITIES) اور نظری قوانین (THEORETICAL LAWS) کو ایک جیتے جاگتے عملی نظام کی شکل میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے پیش کیا۔ اِس لئے نزولِ قرآن کی یاد منانے کے ساتھ یہ بھی ضروری

ہے کہ اس ذاتِ اقدس و اعظم ؐ کی حیاتِ طیبہ کو بھی سامنے لایا جائے جس نے قرآنی حقائق کو محسوس پیکروں میں متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اس نظام کے نتائج نوعِ انسانی کے حق میں کس قدر حیات بخش اور انسانیت ساز ہیں۔

ہمارے ہاں اس حقیقتِ کبریٰ کی یاد تازہ کرنے کے لئے حضور ؐ کے یومِ پیدائش کو بطور جشنِ مسرت (ملّی تیوہار) منایا جاتا ہے جسے عام طور پر عید میلاد النبی ؐ کہا جاتا ہے۔ یہ تقریب حضور ؐ کے یومِ پیدائش سے متعین ہوتی یا یومِ وفات سے۔ واقعۂ ہجرت کی یاد میں ہوتی یا تکمیلِ دین کے اعلان کی مناسبت سے۔ میرے نزدیک اس سے اصل حقیقت پر کچھ فرق نہ پڑتا۔ نہ پڑ سکتا ہے۔ مقصود و مطلوب بہرحال، قرآنی حقائق کی روشنی میں حضور ؐ کی سیرتِ طیبہ کو دنیا کی نگاہوں کے سامنے لانا ہے۔ اگر ہم اس مقصد کے لئے اس تقریبِ سعید کو مناتے اور اس انداز و اسلوب سے آپ ؐ کی سیرتِ مقدسہ کو دنیا کے سامنے پیش کرتے، تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اگر ہم اب بھی اس تقریب کو اس انداز سے منائیں اور دنیا کے سامنے خالص قرآن کی تعلیم اور اس کی روشنی میں حضور ؐ کی سیرت کو پیش کریں، تو میں علیٰ وجہ البصیرت دل کے پورے اطمینان سے، کہہ سکتا ہوں کہ پوری نوعِ انسانی اس تقریب کو منانے لگ جائے۔ اس لئے کہ میرے گھر کا دیا، میرے صحنِ خانہ کو روشن کرتا ہے اس لئے وہ صرف میرا دیا کہلاتا ہے۔ لیکن سورج ساری دنیا کو روشن کرتا ہے اس لئے وہ پورے عالمِ انسانیت کا مشترکہ چراغ ہوتا ہے۔ کسی خاص فرد۔ خاندان، قبیلہ، قوم یا ملک کا سورج نہیں ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

آفتاب عالمتاب

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا (۳۳/۴۶) "اے نبی! ہم نے تجھے (تمام اقوامِ عالم کے اعمال کا) نگران۔ زندگی کی صحیح روش پر چلنے کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دینے والا اور غلط راستے پر چلنے کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ نیز خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کو خدا کی طرف بلانے والا اور دنیا کو روشن کرنے والا سورج۔"

نبی اکرم ؐ سے پہلے، حضرات انبیاءِ کرام ؑ مختلف قوموں کی طرف آتے تھے (اس لئے کہ اس وقت ابھی انسان کی نگاہ اتنی وسیع اور اس کا ذہن اتنا بلند نہیں ہوا تھا کہ وہ تمام نوعِ انسانی کی عالمگیر برادری کے تصور کو اپنا سکتا۔) لیکن آپ ؐ کا ظہور تمام عالمِ انسانیت کے لئے تھا (اور خدا کے آخری نبی کو ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا) اس لئے قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا۔ (۳۴/۲۸) "اور ہم نے تجھے تمام نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔" اس کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی کہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ

ساری دنیا کے لئے رسول

اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (۷/۱۵۸) "عالمِ انسانیت کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔" اسی سلسلۂ زرّیں کی ایک درخشندہ کڑی وہ آیۂ جلیلہ بھی ہے جو آج کے موضوع کا عنوان ہے۔ یعنی وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۱/۱۰۷)

اور ہم نے تجھے تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اسلام کا خدا، رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱/۱) اس کا ضابطہ قوانین (قرآن) ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۸۸/۳۸) اور اس کا رسُول رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۰۷/۲۱) اس میں رنگ - نسل - خون - زبان - وطن کی کوئی تخصیص و تمیز نہیں۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ایک غیر مسلم یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اپنے رسُول کے متعلق اپنی ذات کے لئے جو عقیدہ چاہیں رکھیں۔ لیکن آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ غیر مسلم اقوامِ عالم کے لیئے بھی رحمت ہیں؟ یہ سوال غور طلب ہے اور آج کی نشست میں اسی کا جواب میرے پیشِ نظر ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس موضوع کی طرف آؤں، یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ "رَحْمَةً" کے معنی کیا ہیں۔ عام طور پر رحمت اور رحم کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے اور اس اعتبار سے رحمۃ کا ترجمہ بھی رحم ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی (MERCY) چنانچہ آپ قرآنِ کریم کے انگریزی تراجم میں اس لفظ کا ترجمہ (MERCY) ہی دیکھیں گے۔ لیکن اس سے اس لفظ (رحمۃ) کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کیلئے لفظ رِحم کو سامنے لایئے جس میں جنین (بچے) کی نشوونما ہوتی ہے۔ لہذا "رحمۃ" کے معنی ہوتے ہیں سامانِ پرورش یا وہ قالب (PATTERN) جس کے اندر کسی کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔ اس میں نرمی اور لطافت کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے۔ بنا بریں، آیت زیرِ نظر کے معنی یہ ہوں گے کہ اقوامِ عالم کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما (DEVELOPMENT) اسی قالب (PATTERN) میں ہو سکتی ہے، جسے نبی اکرمؐ نے پیش فرمایا۔ اسی سے افرادِ انسانیہ کو وہ سامانِ زیست وارتقاء مل سکتا ہے جس سے ان کی دبی ہوئی، خوابیدہ، صلاحیتیں ابھر کر توانائی حاصل کر لیں۔ قرآن نے رحمت کے اس مفہوم کو ایک مثال کے ذریعے خود واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ (۴۲/۲۸) "اور وہی ہے جو مایوسیوں کے بعد بارش برساتا ہے اور (اسی طرح) اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے"۔ بارش کیا کرتی ہے؟ زمین مردہ کو زندگی عطا کرتی ہے۔ اس کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو نشوونما دیتی ہے۔ اسی کو قرآن رحمت سے تعبیر کرتا ہے۔

رحمت کے معنی

اس مثال میں قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنی رحمت (سامانِ نشوونما) کو انتہائی مایوسیوں کے عالم میں بھیجتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب حضورؐ رحمۃ للعالمین کا ظہور ہوا تو دنیا کا نقشہ کیا تھا؟ کیا وہ بہار آفریں اُمیدوں اور مسرتوں کا گہوارہ تھی یا افسردگی خیز مایوسیوں اور نامرادیوں کا حسرت کدہ! اس کے متعلق ہم سے نہیں بلکہ ایک غیر مسلم مؤرخ کی زبان سے سُنیئے (میں نے ابھی کہا ہے کہ ایک غیر مسلم یہ سوال کر سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ کا ظہور، غیر مسلم اقوامِ عالم کے لئے کس طرح آیۂ رحمت تھا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے جواب میں جو کچھ کہا جائے بالعموم غیر مسلموں کی شہادات سے کہا جائے تاکہ قرآن کے اس دعوے کی صداقت نکھر کر سامنے آجائے۔) تہذیب کے مؤرخ ڈینی سن (DENISON) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے EMOTION AS THE BASIS OF CIVILIZATION اس مصنف کی شہرت اور اس کی تصنیف کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک طرف وائٹ ہیڈ (WHITE HEAD)

ظہورِ قدسی کے وقت دُنیا کی حالت

جیسا ہیں الاقوامی پایہ کا مفکر اپنی کتابوں میں اسے (QUOTE) کرتا ہے اور دوسری طرف علامہ اقبالؒ جیسا حکیم الامت اس کا اقتباس اپنے خطبات میں دیتا ہے۔ وہ ظہورِ نبویؐ کے زمانہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:۔

اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مشید جس کی تعمیر پر چار ہزار سال صرف ہوئے تھے منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ قدیم قبائلی آئین ومسالک اپنی قوت واحترام کھو چکے تھے اس لئے اب ملوکیت کے پرانے طرق و انداز کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن قواعد وضوابط کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یک جہتی کے بجائے تشتت وافتراق اور بربادی و ہلاکت کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز وشاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ ۔۔ سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت واحترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جنگ وجدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے یکجا کھڑے تھے اور جن کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نکتہ پر جمع کر دے اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لے؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیئے تھا، اس لئے کہ پرانی رسومات و آئین سب مُردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور قوانین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

اس سوال کا جواب وہ خود ہی ان الفاظ میں دیتا ہے۔

یہ امر موجبِ حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا۔ اور اس وقت پیدا ہوا جب اس کی اشد ضرورت تھی۔

یہ نیا کلچر (اسلام) کس قسم کا انقلاب لایا، اس کے متعلق کارلائل اپنی مشہور تصنیف (HEROES AND HERO WORSHIP) میں لکھتا ہے:۔

عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعے پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی اُن کی طرف ایک رسولؐ آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔

وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہو گئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چلے ہیں کہ یہ اسی شان وشوکت اور درخشندگی وتابندگی سے کرۂ ارض

کے ایک عظیم حصہ پر مسلّط ہیں۔ یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

وہ عرب ــــ یہ محمدؐ ــــ اور صرف ایک سو سال کا عرصہ!

کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی آگرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتش گیر مادہ میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آجائے۔

نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔

یہ تو اس سرزمین میں ہوا جو اس "جدید کلچر" کا اوّلین گہوارہ بنی اور اس قوم کے لئے ہوا جس نے اس "کلچر" کو سب سے پہلے محسوس پیکر (قرآنی نظام) میں متشکل کیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ "کلچر" باقی دنیا کے لئے کس طرح حیات آفریں ثابت ہوا اور اس سے نوعِ انسانی کی دبی ہوئی صلاحیتوں نے کس طرح نشوونما پائی!

قرآنِ کریم نے نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) "وہ ان تمام بوجھوں کو اتار دے گا جن کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی تھی۔ اور ان تمام زنجیروں کو توڑ کر پھینک دے گا جن میں افرادِ انسانیہ جکڑے ہوئے تھے۔" سوال یہ ہے

حریّت بخش نبوّت

کہ وہ کونسے بوجھ تھے جن کے نیچے انسانیت دبی ہوئی تھی۔ اور وہ کونسی زنجیریں تھیں جن میں ان کا بند بند جکڑا ہوا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی طول طویل ہے لیکن اگر اسے مختصراً دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ بوجھ اور زنجیریں ارباب قوت و اقتدار کا استبداد تھا جس نے انسانیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس استبداد کی نوعیتیں مختلف تھیں۔ لیکن قرآن نے اسے تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کر کے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ استبداد کی نوعیت کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ اصل کے اعتبار سے ان تین شقوں میں سے کسی ایک سے متعلق ہوگا۔ ان شقوں کو اس نے داستانِ بنی اسرائیل میں یکجا بیان کر دیا ہے۔ یعنی ملوکیت کا استبداد ــــ جس کا نمائندہ فرعون تھا ــــ پیشوائیت (PRIEST CRAFT)

تین زنجیریں

کا استبداد جس کی زنجیریں جسم کو نہیں بلکہ انسان کے قلب و دماغ کو جکڑ دیتی ہیں۔ اس کا ترجمان ہامان تھا ــــ اور سرمایہ پرستی کا استبداد جو شیروں کو لوٹری بنا دیتا ہے۔ اس کا مجسمہ قارون تھا ــــ آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ ہر جگہ یہی نظر آئے گا کہ ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری نے اپنے گٹھ جوڑ سے انسانیت کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ ملوکیت انسان کی طبعی آزادی کو سلب کرتی ہے۔ پیشوائیت اس کی فکری صلاحیتوں کو تباہ کرتی اور سرمایہ داری اس کی اخلاقی جرأتوں کو پامال کرتی چلی آئی ہے۔ یہی تھیں وہ استبداد کی زنجیریں اور توہم پرستی کی برف کی سلیں جنہیں اس نظام نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جسے قرآنی اصولوں کی روشنی میں نبی اکرمؐ نے قائم کیا تھا۔ یہی نظام وہ رحمت (PATTERN)

ہے جس کے اندر نوعِ انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔

ملوکیت کا استبداد

ملوکیت کے استبداد کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ محکومی یا اطاعت قانون کی ہوگی نہ کہ اشخاص کی۔ اور جہاں تک قانون کا تعلق ہے اس کے غیر متبدل اصول و حدود خود خدا کے مقرر کردہ ہیں۔ کسی انسان کو اختیار نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل یا حک و اضافہ کر سکے۔ ان اصولوں کی روشنی میں، انسانوں کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ اس مشاورت میں ساری اُمت اپنے نمائندگان کی وساطت سے شریک ہوگی۔ ان نمائندگان کے انتخاب میں معیار قلب و دماغ کی صلاحیت ہوگا۔ نہ کہ حسبِ نسب یا دولت و حشمت۔

پیشوائیت کا استبداد

پیشوائیت کے استبداد کا خاتمہ یہ کہہ کر کر دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں۔ کوئی وسیلہ اور واسطہ نہیں۔ اطاعت خدا کے اس قانون (قرآن) کی ہوگی جو اس نے اپنے رسولؐ کی وساطت سے نوعِ انسانی کو دیا۔ اور یہ اطاعت ہوگی اس نظام کے توسط سے جو اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ اس قانون و نظام کی طرف دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جائے اور کسی سے کوئی عقیدہ یا نظریہ زبردستی نہیں منوایا جائے گا۔

اس نے صرف پیشوائیت ہی کو ختم نہیں کیا بلکہ خود سلسلۂ نبوت کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے جس قدر اصولی تعلیم کی ضرورت تھی اسے مکمل شکل میں دے کر (قرآن کی دفتین میں) ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اب انسان، ان اصولوں کی روشنی میں، زندگی کے بدلنے والے تقاضوں کا حل اپنے علم و بصیرت کی رو سے خود تلاش کرے۔ اب یہ بچہ جوان ہو گیا ہے۔ اب اُسے کسی انگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے سامنے قرآن کے اصول اور ان کا عملی نمونہ اس نظام کا نقشہ ہے جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قائم کیا تھا۔ اس کے بعد اسے کسی آنے والے کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ جسے آنا تھا وہ آخری بار ساری دنیا کے لئے بشیر و نذیر بن کر آ گیا۔

علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

> اس نقطۂ خیال سے دیکھئے تو پیغمبر اسلام، دنیائے قدیم و جدید کے درمیان بطور حدِ فاصل کھڑے دکھائی دیں گے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپؐ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر نظر جائے کہ آپؐ کی وحی کی روح کیا ہے تو آپ کی ذاتِ گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپؐ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پا لیا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہوں کے لئے ضرورت تھی، اسلام کا ظہور، استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہدِ طفولیت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن کریم غور و فکر اور تجارب د

مشاہدات پہ بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علمِ انسانی کے ذرائع ٹھیراتا ہے۔
یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختمِ نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہے۔ (خطباتِ مدراس)

جہاں تک توہم پرستیوں کا تعلق تھا۔ اس نے ان کا خاتمہ یہ کہہ کر کر دیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے انسان کے لئے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے۔ "یہ وہ ملائکہ ہیں جو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں" لہٰذا انسان کا مظاہرِ فطرت میں سے کسی کے سامنے جھکنا یا کسی سے ڈرنا تذلیلِ آدمیت اور تحقیرِ شرفِ انسانیت ہے۔ انسان کو قوانینِ الٰہیہ کے آستانہ عالیہ پر جھک کر، دنیا کی ہر چوکھٹ سے بے نیاز، سرفرازانہ آگے بڑھ جانا چاہیئے۔

غلامی کا خاتمہ

اس نے غلامی کا یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا کہ خدا نے ہر انسان کو محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم بنایا ہے۔ اس لئے کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے۔ باقی رہے مدارج سو ان کا معیار سیرت و کردار کی بلندی اور فرائض شناسی و حسن کارکردگی ہے اور یہ میدان تمام افرادِ انسانیہ کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

اس نے غلط معیاروں کے مطابق انسان اور انسان میں تفریق و تقسیم کو کسی خاص معاشرہ۔ خاص قوم۔ خاص خطۂ زمین ہی میں نہیں مٹایا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ تمام اقوامِ عالم اصل کے اعتبار سے ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی برادری کے اجزا ہیں۔ لہٰذا رنگ۔ نسل۔ خون۔ زبان۔ وطن کے خود ساختہ معیاروں کے مطابق نوعِ انسان کو قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کر دینا اور پھر ایک قوم کا دوسری قوم کے مقابلہ میں محاذ قائم کر لینا اور یوں اس جنتِ ارضی کو درندوں کا بھٹ بنا لینا، انسانیت نہیں۔ سبعیت و بہیمیت ہے۔ انسانوں میں تفریق و تقسیم کا معیار صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ انسانیت کے بلند نصب العین حیات پر یقین رکھیں وہ ایک برادری کے فرد اور جو ذاتی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ کر اس عالمگیر برادری کے تصور کی مخالفت کریں، وہ دوسری قوم کے افراد۔ بالفاظِ دیگر قومیت کا معیار آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے۔ نہ کہ نسل اور وطن کا اشتراک۔ سرمایہ پرستی کے قارونی استبداد کو اس نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ذرائع رزق اور وسائل پیداوار

سرمایہ پرستی کا خاتمہ

(ارض) کو تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ انہیں ذاتی ملکیت سمجھ کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے۔ جہاں تک دولت کا تعلق ہے، ضرورت سے زائد دولت کسی شخص کے پاس نہیں رہنی چاہیئے۔ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ (نظام) پر ہونی چاہیئے۔ انسانی آزادی کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ کوئی فرد، اپنی کسی ضرورت کے لئے، کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس!
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

یہ تھیں انسانی استبداد کی وہ زنجیریں جنہیں ایک ایک کر کے توڑا گیا۔ لیکن اس استبداد کا ایک گوشہ

ایسا ہے جو ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ دنیا میں مردوں نے ایک افسانہ تراشا کہ "آدم کو جنت سے نکلوانے کا باعث اس کی بیوی تھی، اور اس کے بعد یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ تمام فتنے اور فساد کی جڑ عورت ہے" اس لئے اس پر جس قدر سختی کی جائے کم ہے۔ آپ تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالیئے اور دیکھئے کہ ظہورِ نبویؐ سے پہلے دنیا میں عورت کی حالت کیا تھی۔ اس حالت پر غور کیجئے اور پھر اس اعلانِ عظیم کو دیکھئے کہ پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت کی حیثیت یکساں ہے اور فطری فرائض کے اعتبار سے اگر مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے تو ویسی ہی فضیلت عورت کو مرد پر بھی حاصل ہے۔ فتنہ و فساد کا سرچشمہ نہ عورت ہے نہ مرد۔ دونوں میں لغزش کا امکان اور استقامت کی صلاحیت موجود ہے۔

عورت پر استبداد

یہ ہیں برادرانِ عزیز! وہ چند اہم اصول جن کی بنیادوں پر نبی اکرمؐ نے ایک ایسا معاشرہ استوار فرمایا جس نے ہر نظامِ کہن کی بساط الٹ کر، استبداد کی ہر اس زنجیر کو توڑ دیا جو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے راستے میں آہنی دیوار بن کر حائل تھی۔ قرآن نے اس تمام داستان کو چند الفاظ میں اس حسن و خوبی کے ساتھ سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ جب نگاہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو روح وجد میں آجاتی ہے۔ آپ ان آیات کو سامنے لایئے جن میں نبیٔ اکرمؐ کو رحمۃ للعالمین کہہ کر پکارا گیا ہے اور پھر دیکھئے کہ قرآن نے اس حقیقتِ کبریٰ کی کس حسین و جمیل انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ قبل اس کے کہ ان آیات کو سامنے لایا جائے۔ آپ ایک مرتبہ پھر اس داستانِ کہن کو دہرا لیجئے کہ حضورؐ کے ظہورِ قدسی سے پہلے دنیا کا نظام کیا تھا؟ نظام یہ تھا کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس نے کسی طرح قوت حاصل کر لی، اقتدار کی مسندوں پر قابض ہو گیا۔ اور پھر یہ قبضہ و اختیار۔ یہ سطوت و اقتدار، اس کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتا چلا آیا۔ اس میں نہ استعداد و قابلیت کا کوئی سوال تھا نہ صلاحیت کی کوئی شرط۔ اس پس منظر میں دیکھئے کہ وہ نظام جسے اس رحمۃ للعالمینؐ کے مقدس ہاتھوں نے متشکل فرمایا، اس کا اصل الاصول کیا تھا؛ فرمایا وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ۔ ہم نے ہر آسمانی کتاب میں، اخلاقی اقدار و ضوابط بیان کر دینے کے بعد لکھ دیا تھا (اور اب اس بنیادی حقیقت کو قرآن میں دہراتے ہیں) کہ زمین کا نظم و نسق صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے جن میں اس کی صلاحیت ہو۔ (صلاحیت میں قلب و دماغ دونوں کی صلاحیت آجاتی ہے۔) یعنی آئینِ جہاں بانی کے لئے تدبر اور سیرت و اخلاق کی پاکیزگی اور بلندی۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے اس مختصر سے ٹکڑے میں کتنے بڑے انقلاب کا اعلان کیا ہے۔ جس سے نظم و نسق اور اقتدار و اختیار کے تمام سابق معیار الٹ کر، ان کی جگہ صرف صلاحیت نے لے لی۔ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ۔ "اس انقلاب آفریں اصول میں، اس قوم کے لئے جو قوانینِ الٰہیہ کی محکومی اختیار کرے، ایک بڑی دور رس حقیقت پوشیدہ ہے۔" اور اس کے بعد ہے۔

وراثتِ ارض کا محکم اصول

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱/۱۰۷)

"یوں اے رسول! تمہاری بعثت تمام اقوامِ عالم کے لئے وہ قالب۔ وہ ذریعہ۔ وہ (PATTERN) بن جاتی ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افرادِ انسانیہ کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکتی ہے۔"

آپ نے حضورؐ رحمۃ للعالمین کی بعثت سے پہلے کی ہزاروں سال کی تاریخ انسانیت کو دیکھا۔ اس کے بعد آپ اس ظہورِ قدسی کے بعد کی چودہ سو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ زندگی کے وہ اصول جنہیں قرآن نے عطا کیا اور جن کی روشنی میں نبی اکرمؐ نے ایک نظامِ جدید کی بنیاد ڈالی، کس طرح وہ قالب بن گئے جن کے اندر نوعِ انسانی کی دبی ہوئی صلاحیتوں نے انگڑائی لے کر آنکھ کھولی۔ اور پھر یہ سبزۂ نورستہ دیکھتے ہی دیکھتے شادابیوں اور شگفتگیوں کا لالہ زار بن گیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ورنہ میں مغرب کے غیر مسلم مفکرین، مصنفین اور مؤرخین کے سینکڑوں آراء و اقوال پیش کرتا جن میں انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے

اسلام کا احسان یورپ پر

کہ حضور رحمۃ للعالمینؐ کا ظہور نہ ہوتا تو اس خاکدان کی رنگینیاں اور رعنائیاں کبھی اس ہجوم و وفور سے تبسم ریز و کیف بار نہ ہوتیں۔ اس وقت میں آپ کے سامنے (BRIFFAULT) کی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ دیکھئے کہ یہ نامور مؤرخ اس حقیقت کا اعتراف کن الفاظ میں کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

یورپ کی نشاۃِ ثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا۔ یورپ کی خلقتِ جدیدہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اندلس ہے۔ اِدھر روما کی تہذیب گرتے گرتے بربریت کی حد تک پہنچ چکی تھی اور اُدھر دنیائے اسلام تہذیب و ذہنی تحریکات کی مرکز بن رہی تھی۔ انہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی ہے جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا۔ جس وقت یہ نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی دنیا حیاتِ نو سے آشنا ہوئی۔

..... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود ہی عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ ویسے تو مغربی کلچر میں کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے۔ یعنی علم الاشیاء۔ سائنس کی روح۔ ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہینِ منت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و انکشافات سے روشناس کرایا۔ نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کا زمانہ، درحقیقت زمانۂ قبل از سائنس (PRE SCIENTIFIC) تھا۔ پندرھویں صدی تک یورپ انہی علوم و فنون کو اپناتا رہا جو اسے مسلمانوں نے دیئے تھے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ جب اندلس میں تہذیب و ثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی تو یورپ میں وہ "جن" نمودار ہوا جسے اندلس کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی صرف سائنس نے دی۔

اسلام کے گوناگوں اثرات اِس کی حرارت کا موجب بنے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے یہ صدقہ ہے اُس "رحمت" کا جسے تمام اقوامِ عالم کے لئے عام کر دیا گیا تھا۔ دنیا قرآنی اصولوں اور اس کی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کئی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے۔ بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ مستقبل میں جا کر اپنائے گی۔ اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی نشو و ارتقاء کی آخری حد تک پہنچ سکتی ہیں نہ حسن کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بزمِ ہستی میں جہاں کوئی روشنی کی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتابِ عالمتاب کی ضیا باریوں کے تصدق ہے اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جانِ بہار کی نکہت باریوں کا رہینِ منّت ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو   آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہاست   یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

میں نے جو کچھ ابھی ابھی کہا ہے وہ محض ہماری عقیدت کا اظہار نہیں۔ وہ ایک واقعہ ہے جو ہر اس آنکھ کے سامنے بے نقاب آ سکتا ہے جس پہ تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو۔ میں آپ سے اجازت چاہوں گا کہ آپ کے سامنے ——— (LAMARTINE) کی مشہور تصنیف (HISTORE DE LA TURQUE) کا ایک اقتباس پیش کروں۔ اقتباس طویل ضرور ہے لیکن حضور رحمۃ للعالمین کی شانِ اقدس میں، ایک غیر مسلم کی زبان سے، اس سے بہتر "نعت" کم از کم میری نظروں سے نہیں گذری۔ سنیئے اور اس شہادت میں میرے ہمنوا ہو جایئے ——— وہ لکھتا ہے:۔

> دنیا میں کسی انسان نے، برضا و رغبت یا طوعاً و کرہاً، محمدؐ کے نصب العین سے بلند نصب العین اپنے سامنے کبھی نہیں رکھا۔ یہ نصب العین عام انسانی سطح سے بہت بلند تھا۔ مافوق البشر نصب العین۔ یہ نصب العین کیا تھا؟ خدا اور بندے کے درمیان، جو توہمات کے پردے حائل ہو چکے تھے انہیں ایک ایک کر کے اٹھا دینا اور اس طرح خدا کو انسان کے سینے میں سمو دینا اور انسان کو خدائی صفات کے رنگ میں رنگ دینا۔ اور باطل خداؤں کے ہجوم میں ایک منزہ خدا کا مقدس اور معقول تصوّر پیش کرنا۔ آج تک کبھی کسی انسان نے اس کی ہمّت نہیں کی کہ اس قسم کے عظیم الشان کام کا بیڑہ اٹھائے جو اس طرح انسانی مقدرت سے باہر ہو اور اس کے ذرائع اس قدر مسدود و محدود۔ اس لئے کہ نہ اُس وقت، جب اس نے اس اہم فریضہ کا تصوّر کیا تھا اور نہ اُس وقت جب اِس کی عملی تشکیل کے لئے قدم اُٹھایا تھا۔ اس کے پاس اپنی ذات یا صحرا کے ایک گوشے میں بسنے والے مٹھی بھر انسانوں سے زیادہ کوئی ساز و سامان اور ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ اس فقدانِ ذرائع کے ساتھ آج تک کبھی کسی انسان نے دنیا میں اس قسم کا عظیم اور مستقل انقلاب پیدا نہیں کیا۔ وہ انقلاب جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو سو سال کے اندر اندر اسلام عملاً اور اعتقاداً تمام عرب پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس نے خدا کے نام پر، ایران، خراسان، مغربی ہندوستان، شام، مصر، حبش، شمالی افریقہ کا تمام وہ علاقہ جو اس وقت دریافت ہو سکا تھا، اور بحیرہ روم

کے متعدد جزائر اور ہسپانیہ تک کو فتح کر لیا تھا۔

اگر نصب العین کی بلندی، وسائل کی کمی اور نتائج کی درخشندگی، انسانی نبوغ (HUMAN GENIUS) کا معیار ہیں تو وہ کون ہے جو اس باب میں محمدؐ کے مقابلہ میں کسی اور انسان کو پیش کرنے کی جرأت کر سکے۔ دنیا کے اور بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون یا سلطنتیں پیدا کیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مادی قوتوں کی تخلیق کر سکے جو اکثر اوقات خود ان کی آنکھوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اس انسان نے صرف جیوش و عساکر، مجالسِ قانون ساز، وسیع سلطنتوں، قوموں اور خاندانوں کو ہی حرکت نہیں دی بلکہ ان کروڑوں انسانوں (کے قلوب) کو بھی اس زمانہ کی آباد دنیا کے ایک تہائی حصہ میں بستے تھے۔ اور ان سے بھی کہیں زیادہ، اس شخصیت نے قربان گاہوں، دیوتاؤں، مذاہب و مناسک، تصورات و معتقدات بلکہ روحوں تک کو ہلا دیا۔ اُس نے ایک ایسی کتاب کی اساس پر جس کا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے ایک اُمّتِ واحدہ پیدا کر دی۔ یہ لافانی اُمّت اور باطل کے خداؤں سے سرکشی و تنفّر۔ اور ایک خدائے واحد کے لئے والہانہ جذب و عشق۔ یہ ہیں دنیا میں اس عظیم ہستی کی یادگاریں۔ انسانوی خداؤں کے ہجوم میں، ایک خدا کے تصوّر کا اعلان، بجائے خویش ایک ایسا معجزہ تھا کہ جونہی یہ الفاظ اس منادؐ کی زبان سے نکلے اس نے تمام باطل خداؤں کی عبادت گاہوں کو تباہ کر دیا۔ اور ایک تہائی دنیا میں آگ لگا دی۔ اُس کی زندگی۔ اس کے مراقبات۔ توہم پرستی کے خلاف اس کی مجاہدانہ سعی و کاوش اور باطل خداؤں کے غیظ و غضب کو استحقار کی ہنسی سے ٹھکرا دینے کی عظیم جرأت۔ مکّی زندگی میں متواتر تیرہ برس تک تمام مصائب و نوائب کے مقابلہ میں استقامت و استقلال۔ مخالفین کی تکذیب و تضحیک کا خندہ پیشانی سے استقبال۔ یہ تمام مشکلات اور ہجران کے بعد، اس کی ہجرت، اس کی مسلسل دعوت و تبلیغ، اس کا غیر منقطع جہاد، اپنے مقصد کی کامیابی پر یقینِ محکم اور نامساعد حالات میں اُس کی مافوق البشر جمعیتِ خاطر۔ فتح و کامرانی میں تحمّل و عفو، سلطنت سازی کی خاطر نہیں، بلکہ اپنے الوہیاتی مقصد کی کامیابی کے لئے اس کی اُمنگیں اور آرزوئیں۔ وجد و کیف کی دنیا میں اس کی متواتر نمازیں اور دعائیں۔ اپنے اللہ سے راز و نیاز کی باتیں۔ اُس کی حیات۔ اُس کی ممات۔ اور بعد از موت اس کی مقبولیت۔ یہ تمام حقائق کس قسم کی زندگی کی شہادت دیتے ہیں؟ کیا ایک مکذّب و مفتری کی زندگی کی یا ایسے انسان کی زندگی کی جسے اپنے دعوے کی حقانیت پر غیر متزلزل ایمان ہو! اس کا یہی کوہ شکن ایمان تھا جس نے اس میں ایسی لرزہ انگیز اور بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی جس سے اس نے اپنے عقیدہ کو زندہ و پائندہ بنا کر یہ عقیدہ کیا تھا؟ خدا کی توحید اور تنزیہہ۔ اوّل الذکر یہ بتانے کے لئے کہ خدا کیا ہے۔ اور ثانی الذکر اس کی وضاحت کے لئے کہ خدا کیا نہیں۔ وہ الٰہ اور یہ لا — ایک حصّہ، دنیا سے باطل خداؤں کو مٹانے کے لئے (خواہ اس میں تلوار کی بھی ضرورت کیوں

نہ پڑے۔) اور دوسرا حصہ خدائے حقیقی کی مسندِ جلال بچھانے کے لئے۔

بہت بڑا مفکر، بلند پایہ خطیب، پیغامبر، مقنن، سپہ سالار، تصورات و معتقدات کا فاتح۔ جمیع نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت قائم کرنے کا ذمہ دار۔ اس نظام کا بانی جس میں باطل خدا ذہنوں تک کی دنیا میں دخل نہ پا سکیں۔ بیس دنیاوی سلطنتوں اور ان کے اوپر ایک آسمانی بادشاہت کا بانی۔ یہ ہے محمدؐ۔

اُن تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ماپا، اور پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کا جواب دو کہ

کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی ہوا ہے؟

آپ نے غور فرمایا برادران! کہ ایک حقیقت شناس غیر مسلم کی نگاہیں کہاں تک پہنچی ہیں اور اس نے اس رحمۃ للعالمینی کی جھلک کہاں کہاں اور کس کس انداز سے دیکھی ہے؟ یہ حضورؐ کی سیرت کی بلندی اور پاکیزگی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دیا ہے۔

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال اُبھرے گا کہ اس "رحمت" سے اقوامِ عالم کی صلاحیتیں تو بیدار ہو گئیں لیکن مسلمانوں کی صلاحیتیں یکسر افسردہ و پژمردہ ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی خیال علامہ اقبالؒ کے دل میں بھی پیدا ہوا تھا جسے انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں "شکوہ" کے رنگ میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر — برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

اور اس کا جواب بھی انہی نے "جوابِ شکوہ" میں (خدا کی طرف سے) بدیں الفاظ دیا تھا۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں!
تربیت عام تو ہے! جوہرِ قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

قرآنِ کریم میں جہاں حضورؐ کو رحمت للعالمینؐ قرار دیا گیا ہے وہیں یہ بھی ارشاد ہے کہ

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۱/۱۰۸)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میری طرف یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ تمہارا اِلٰہ جس کے قوانین کی اطاعت اختیار کرنی چاہیئے صرف ایک خدا (خدائے واحد) ہے۔ اب بتاؤ کہ تم ان قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہو؟

اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ (۷/۱۵۶)

یعنی یہ رحمت مشروط ہے اس بات سے کہ تم اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہو یا نہیں۔ اگر تم اس پر ایمان نہیں رکھتے تو پھر اس رحمت کے مستحق کیسے ہو سکتے ہو؟

اقبالؒ نے مندرجہ بالا اشعار کے بعد کہا ہے کہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں — اُمتی باعثِ رسوائیٔ پیغمبر ہیں
بت شکن اُٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں — تھا براہیم پدر۔ اور پسر آذر ہیں

بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

تم نے خدا کے نازل فرمودہ اسلام کی جگہ ایک نیا اسلام وضع کر رکھا ہے؛ تم نے اطاعت کے لئے قوانینِ خداوندی کی جگہ انسانوں کے مرتب کردہ احکام اختیار کر رکھے ہیں۔ کیا اسی کا نام الدین ہے اور اسی کو توحید کہا جائے گا؛ نام کے سوا تم میں اُمتِ محمدیہ کی کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر تم حضورؐ کی رحمۃ للعالمینی کے متمنّی ہو؛

کہا جائے گا کہ غیر مسلم اقوام جو دنیا میں آگے بڑھ رہی ہیں، وہ بھی تو قرآن پر ایمان نہیں رکھتیں۔ وہ کس طرح رحمتِ خداوندی سے متمتع ہو رہی ہیں؛ اس میں شبہ نہیں کہ وہ قرآن پر من حیث الکل (قرآن کی ساری تعلیم پر) ایمان نہیں رکھتیں لیکن قرآن کی جس تعلیم کا تعلق تسخیرِ کائنات سے ہے، وہ ان اصولوں کی صداقت پر یقین رکھتی ہیں اور اسی حد تک رحمتِ خداوندی سے بہرہ یاب ہو رہی ہیں۔ طبیعی زندگی کے فوائد کے متعلق خدا کا قانون یہی ہے کہ جو لوگ بھی ان کے حصول کے لئے، ان قوانین کے مطابق محنت کریں گے انہیں یہ مفاد حاصل ہو جائیں گے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۷/۲۰) اس میں اصطلاحی کافر و مومن کی تمیز نہیں۔ ان نعمائے خداوندی کا دروازہ ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ وہ قوانینِ خدا کے طبیعی قوانین پر ایمان رکھتی ہیں اس لئے متاعِ فطرت سے فیضیاب ہو جاتی ہیں۔ ہم مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ قرآنِ کریم پر بالکلیہ ایمان رکھنا تو ایک طرف، ہم ان قوانین کی صداقتوں پر بھی یقین نہیں رکھتے جن کا تعلق مادی کائنات سے ہے اس لئے رحمتِ خداوندی کے اس گوشے سے بھی محروم ہیں۔ گوئٹے نے قرآن کے متعلق کہا تھا کہ

> اس کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی ہم اپنے تمام نظام ہائے تمدن کے باوجود اس کی حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔
>
> (گوئٹے کا خط ایکرمن کے نام)

لیکن ہم نے اس قرآن کو غلافوں میں لپیٹ کر رکھ چھوڑا ہے اور اپنی راہ نمائی کے لئے دوسرے دروازوں پر جبہ سائی کرتے ہیں۔ کیا ایمان اسی کو کہتے ہیں؛ لہٰذا، اگر ہماری صلاحیتیں نشو و نما نہیں پاتیں تو اس میں قصور کس کا ہے؛ سورج اسی کو روشنی دے سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ بارش اسی زمین کے لئے نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے جو اس کے قطروں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے اپنی آغوش وا کر دے۔ ہم نے اس سحابِ کرم کی طرف سے اپنے لب بند کر کے، دنیا کے ہر چشمۂ تہذیب و تمدن کو آزما کر دیکھ لیا۔ کیا کہیں سے آبِ حیات کی ایک بوند بھی ہمارے لئے وجۂ سیرابی ہوئی؛ کیا اس کے بعد بھی وقت

ایک ہی راہ

نہیں آیا کہ ہم پھر اُسی ابرِ نیساں کی طرف رجوع کریں جس کی گہر فشانیوں نے ایک بار ہماری زمین مردہ کو اس طرح زندگی اور شادابی عطا کی تھی کہ اس سے ساری دنیا پر بہار آگئی تھی، یاد رکھیئے، جیسا کہ میں نے اپنی مایۂ ناز تصنیف، معراجِ انسانیت' میں کہا ہے:۔

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اب اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اُٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر!
بحق دل بند و راہِ مصطفٰے رو

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قرآنی نظام کے علاوہ جسے حضورؐ رحمۃ للعالمین نے ساری دنیا کے لئے وجہِ شادابیٔ قلب و نگاہ بنایا تھا۔ انسان کے لئے نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں۔ یہی وہ ساعد فضا ہے جس میں ہر تخمِ صالح بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا ہے۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ اگر صحنِ عالم اس کی نسیمِ سحری سے محروم ہو جائے تو اس کی تمام سرسبزیاں اور شادابیاں مضمحل کر رہ جائیں۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو — بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

قرآنی فیصلے (جلد چہارم) کی یہ جلد جو حال ہی میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے سینکڑوں نئے سوالات اور اُن کے اطمینان بخش جوابات پر مشتمل ہے۔ اس کے ان ابواب کے عنوانات پر ایک نگاہ ڈالئے۔

(۱) قرآنِ مجید ـــــ (۲) نبوت، رسالت، احادیث ـــــ (۳) ہماری تاریخ ـــــ (۴) تقدیر ـــــ (۵) تصوف۔
ـــ (۶) علومِ سائنس ـــــ (۷) عائلی زندگی ـــــ (۸) فرقہ بندی۔ ـــــ ضخامت (پہلی تین جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ یعنی) ۴۲۴ صفحات۔ قیمت -/۱۵ روپے۔ (سابقہ جلدوں کی قیمت۔ جلد اوّل -/۱۰ روپے۔ جلد دوم -/۱۰ روپے۔ جلد سوم -/۱۰ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)۔ (مکمل سیٹ -/۴۵ روپے) (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/ب۔ گلبرگ ۲ لاہور

تحریک طلوعِ اسلام کی رفتار

حق و صداقت کی آواز اپنے زورِ دروں سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس طرح اس کے بڑھنے اور پھیلنے کی رفتار سُست ہوتی ہے لیکن اگر اسے انسانی دست و بازو کا تعاون حاصل ہو جائے تو اس رفتار میں تیزی آجاتی ہے۔ اس کے اس زورِ دروں کی شہادت خود ہمارا تجربہ ہے۔ طلوعِ اسلام کے ذریعے یہ آواز ۱۹۳۸ء میں بلند ہوئی اور تشکیلِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء سے یہ مسلسل اور متواتر بلند کی جا رہی ہے۔ طلوعِ اسلام کا یہ تجربہ بالکل انوکھا ہے۔ اس نے نہ کوئی پارٹی بنائی، نہ اپنے آپ کو کسی مذہبی فرقہ سے متعلق کیا اور نہ ہی اپنا کوئی نیا فرقہ کھڑا کیا۔ نہ ہی اسے کوئی خارجی سہارا میسر آیا۔ اس کے برعکس، مخالفتوں کے ہجوم نے اسے چاروں طرف سے طوفانوں کی طرح گھیرے رکھا۔ اس نے بلا سازوبراق ان سب کا مقابلہ بھی کیا اور اپنے نحیف و نزار قدم آگے بھی بڑھاتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب مخالفتوں کے بادل رفتہ رفتہ چھٹ رہے ہیں اور حقیقت ان قلوب پر بھی روشن ہوتی جا رہی ہے جنہیں یہ کہہ کر ڈرایا جاتا تھا کہ اگر تم نے طلوعِ اسلام کو چھو لیا تو تمہارا ایمان جاتا رہے گا۔ اب نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ (چاروں طرف سے مایوس ہو کر) قرآن خالص کی اس آواز کی طرف لپک کر آ رہا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

طلوعِ اسلام کی بزمیں اس فکر کو آگے پھیلانے کے مقامی مراکز ہیں۔ ہم جس طرح لوگوں کو اس تحریک میں شریک کرنے کے لئے کوئی خاص کوشش نہیں کرتے، صرف قرآن کا پیغام ان تک پہنچاتے رہتے ہیں، اسی طرح، بزم سازی کے لئے بھی خاص جدوجہد نہیں کی جاتی۔ اسے ہم ان احباب کی صوابدید پر چھوڑ دیتے ہیں جو اس فکر سے متفق ہوتے ہیں۔ اس طرح متفق ہونے والے احباب کی اپنی سعی و کاوش سے حال ہی میں دو نئی بزموں کا قیام عمل میں آیا ہے جن کی توثیق کا اعلان، بزموں کے آئین کے مطابق ادارہ کی طرف سے ضروری ہوتا ہے۔

۱۔ بزمِ طلوعِ اسلام، برمنگھم (برطانیہ)۔ محترم محمد سلیمان صاحب اس کے نمائندے منتخب ہوئے ہیں، بزم کا پتہ حسبِ ذیل ہے:۔

CH. M. SULEMAN, 60, HERRICK ROAD, SALTLEY,

BIRMINGHAM. B-8- INT. (U.K) TELE: 021, 327 —5960

۲۔ بزمِ طلوعِ اسلام، ایبٹ آباد۔ محترم غلام مصطفےٰ اعوان (ایڈووکیٹ) بزم کے نمائندہ منتخب ہوئے ہیں۔ ان کا ایڈریس یہ ہے:۔ محترم غلام مصطفےٰ اعوان صاحب، ایڈووکیٹ۔ ایبٹ آباد

ادارہ طلوعِ اسلام ان بزموں کے قیام کی منظوری دیتا ہے اور ان کے نمائندگان کے انتخاب کی توثیق کرتا ہے، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالےٰ ان بزموں کے ارکان اور نمائندگان کو قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے اور ان کی سعی و کاوش سے شمع قرآنی کی روشنی دور دور تک پھیلتی جائے۔ یہی ان کی اور ہماری کاوشوں کا صلہ ہوگا۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

(ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام)

اسلام کو علم و بصیرت کی روشنی میں سمجھنے کیلئے کتابیں

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علومِ حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک (مکمل سیٹ) ۱۲۰ روپے

معراجِ انسانیت

سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینے میں۔ مفکرِ قرآن کا بلند پایہ شاہکار عقل و عشق، فکر و نظر، دل و دماغ کا حسین امتزاج اس سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے مقامِ محمدی اور انقلابِ محمدی نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ حسنِ معنوی کے ساتھ صوری پاکیزگی بھی دیدہ زیب۔ جلد مضبوط و دلکش۔ قیمت -/۴۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب، یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؛ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع۔ عمدہ سفید کاغذ۔ قیمت مجلد -/۳۰ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

جہانِ فردا

مرنے کے بعد کیا ہوگا؛ زندگی کن مراحل سے گذرے گی؛ قیامت، حشر، نشر، میزان، جنت، جہنم کا قرآنی مفہوم کیا ہے؛ اس دنیا کا اُس دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ مُردوں کے لئے "ایصالِ ثواب" کی حقیقت کیا ہے؛ یہ اور اسی قسم کے دیگر متعدد سوالات کے بصیرت افروز جوابات۔

قیمت مجلد -/۲۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

سلیمؔ کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کش مکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اُسے کوسیئے نہیں یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ قیمت مکمل سیٹ -/۲۶ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں

وہ منفرد معلومات افزا کتاب جس کا پہلا ایڈیشن ایک عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا، دوبارہ شائع ہو گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابیں کس طرح مرتب ہوئیں کن مراحل سے گذریں اور اب وہ کس شکل میں ہیں۔ اس کتاب سے جہاں ان مذاہب کے متعلق عجیب و غریب معلومات حاصل ہونگی وہاں مفکرِ قرآن کی وسعتِ مطالعہ اور عمیق تحقیق کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

قیمت مجلد -/۱۲ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

ملنے کا پتہ: مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار لاہور | ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قانون کی حکمرانی

(پرویز)

وہ غالباً (مشہور مغربی مفکر) لاک تھا جس نے کہا تھا کہ تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا ہے، اور میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔ اس مفکر نے بات بڑی پتے کی کہی ہے۔ "معبود" یا تو ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوگا، اور یا اُسے ذہن انسانی نے قابلِ قبول سمجھا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں، وہ اس قوم کی ذہنی سطح اور نفسیاتی اُفتاد کا آئینہ دار ہوگا جس نے اسے اپنی پرستش کے لئے اختیار کر رکھا ہوگا۔ اور چونکہ "معبود" کا مقام، قوم کے تصور میں بلند ترین ہوتا ہے، اس لئے اُس قوم کی تہذیب و تمدن کے خط و خال لازماً اُس (معبود) کی خصوصیات سے متاثر ہوں گے۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ اس کے سانچے میں ڈھلے ہوں گے۔ اگر آپ انسانی تاریخ کا مطالعہ اس نگاہ سے کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اس دعوے کی صداقت کے لئے بیّن شہادات پیش کرتی ہے۔ آپ اپنے ہمسایہ ملک (ہندوستان) کو دیکھئے۔ ان کے ہاں، بادل، بجلی، بارش، سورج، ہوا، زمین، دریا، درخت، گائے، سب دیوی دیوتا مانے جاتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ معبود اُس قوم کے ذہن کے تراشیدہ تھے جو زراعت پیشہ تھی۔ فطرت کی جو قوت، کھیتی کے لئے مفید نظر آئی، انہوں نے اس کے چرنوں (قدموں) میں اپنی شردھا (عقیدت) کے پھول نچھاور کر دیئے۔ جو قوت، ضرر رساں ہوئی، اس کے ڈر سے اس کے سامنے ڈنڈوت بجالائے (جھک گئے)۔ اس سے آگے بڑھے تو انہوں نے زندگی کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا اور ہر شعبہ کے لئے جداگانہ خدا تجویز کر لیا — برہما، پیدا کرنے والا۔ وشنو، پرورش کرنے والا۔ اور شیو جی، فنا کرنے والا۔ زندگی کی یہی تقسیم ان کے معاشرہ کی بنیاد بن گئی اور انسان، برہمن۔ کھشتری۔ ویش۔ شودر کے ورنوں میں منقسم ہو گیا۔ اس تقسیم کا نتیجہ یہ تھا کہ معاشرتی معاملات میں تمام انسانوں کے لئے ایک جیسا قانون نہیں تھا۔ ایک ہی جرم کی سزا، برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کے لئے الگ الگ تھی۔ اگر کوئی اچھوت کسی اونچی ذات والے کو چھو بھی لے تو وہ موت کی سزا کا مستوجب ہو جاتا تھا لیکن برہمن کسی کو قتل بھی کر ڈالے تو اسے سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی۔ لین دین کے معاملات تک میں یہ حالت تھی کہ اگر برہمن قرض لے تو اس سے ۲۴ فی صد سود لیا جاتا تھا۔ کھشتری سے ۳۶ فی صد۔ ویش سے ۴۸ فی صد اور شودر سے ۶۰ فی صد۔ رگوید میں یہاں تک لکھا ہے کہ

اگر کسی عورت کے پہلے دس غیر برہمن خاوند موجود ہوں اور برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے۔ کیونکہ برہمن ہی عورتوں کا مالک یا خاوند ہے نہ کہ کھشتری اور ویش وغیرہ

ہندوؤں کے معبود

ورنوں کی تقسیم

ورنوں کی یہ تقسیم پیدائشی تھی جس پر کسی کو کچھ اختیار نہیں تھا اور نہ ہی یہ بعد میں کسی حسنِ تدبیر یا نیک عملی سے مٹائی جاسکتی تھی۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا تھا کہ برہمنوں کو برہما (خدا) نے اپنے سر سے پیدا کیا ہے۔ کھشتریوں کو اپنے بازوؤں سے۔ ویش کو اپنے پیٹ سے اور شودروں کو اپنے پاؤں سے۔ یہ تفریق برہما نے اپنی مرضی سے کی ہے جس میں کسی کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

مستبد حکمران

اس سے ان کے ہاں مستبد حکمرانوں کا تصور وجود میں آیا جس کی وجہ سے، راجہ کو ایشور (خدا) کا اوتار سمجھ لیا گیا۔ "ایشور کا اوتار" سمجھنے کے معنی یہ تھے کہ راجہ کے ہر حکم کی تعمیل بلا چون و چرا کی جائے گی۔ اس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس کے حکم کی علت اور حکمت کیا ہے۔ ہم اس کی اطاعت کیوں کریں۔ ہم اس کے سامنے کیوں جھکیں۔ اس لئے کہ جس قسم کا آمر مطلق خدا، اسی قسم کا ڈکٹیٹر اس کا اوتار۔

یہودیوں نے اپنے لئے جس "خدا" کو تجویز کیا اس کی تنگ نظری کا یہ عالم تھا کہ وہ تھا ہی بنی اسرائیل کا خدا۔ کسی اور کا نہیں تھا۔ اور بنی اسرائیل اس کی چہیتی اولاد تھی۔ اس کا نتیجہ یہ کہ یہودیوں کو اپنی قوم کے سوا، دنیا کی ہر قوم سے نفرت پیدا ہو گئی۔

یہودیوں کا معبود

پھر ان کا "خدا" ہاتھ میں آتشیں کوڑا لئے، ہر شخص سے اپنا حق وصول کرنے کے درپے تھا۔ نہ اس کے سینے میں دل تھا نہ دل میں لوچ اور لچک۔ اس "خدا" کا پرستار "مرچنٹ آف وینس" کے ڈرامے کا وہ کردار تھا جو اپنے قرضے کے بدلے میں، انسانی گوشت کا ٹکڑا کاٹنے کے لئے خنجر بدست رہتا تھا۔ (JOSEPH WHEBS.) کے الفاظ میں:-

> تورات کا خدا بے شمار قاتلوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور، غدار، انتقام کے جذبے میں ایک خونخوار عفریت۔ گنہگار اور بے گناہ دونوں کو بے رحمی سے سزا دینے والا۔ نہایت مہیب اور خوفناک۔ ظلم اور تعصب کا مجسمہ۔ متکبر اور شیخی باز۔ وعدہ خلاف۔ غلط بیان اور ڈھٹائی سے جھوٹ بول دینے والا۔
>
> (IS IT GOD'S WORDS)

آپ دیکھئے کہ خدا کا یہ تصور، کس طرح یہودیوں کی پوری تاریخ کی ترجمانی کر رہا ہے۔ جب قوت ان کے ہاتھ میں تھی تو وہ کس قدر مہیب، خوفناک، ظالم اور خونخوار قوم تھی۔ اور جب ان کے ہاتھ سے قوت چلی گئی تو وہ کیسی بددیانت۔ وعدہ فراموش، جھوٹی۔ تنگ نظر اور سازشی قوم بن کر سامنے آئی۔ نہ اس وقت ان کے سامنے قانون اور عدل کا تصور تھا۔ نہ حالات بدلنے پر ان کے پیش نظر آئین و ضوابط کا احترام۔ علاوہ بریں، تورات میں جو قانون دیا گیا ہے۔

تورات کا قانون

اس میں بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل میں کھلی ہوئی تفریق کی گئی ہے۔ مثلاً تورات کی کتاب استثناء میں ہے کہ اگر کسی اسرائیلی نے اپنے بھائی کو قرضہ دیا ہو تو سات سال کے بعد اسے وہ قرضہ معاف کر دینا ہو گا۔ لیکن غیر بنی اسرائیل سے اس کا مطالبہ بدستور رہے گا۔ (استثناء ۱۵/۳)۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ ہے کہ بنی اسرائیل کو بلا سود قرض دیا جا سکتا ہے لیکن غیر بنی اسرائیل کو نہیں دیا جا سکتا۔ (۲۳/۲۰) اسی طرح اگر کوئی شخص بنی اسرائیل کے کسی بچے کو اغوا کرے تو اس کی سزا موت تھی۔ لیکن غیر بنی اسرائیل

کے بچے کے سلسلہ میں کسی سزا کا ذکر نہیں ملتا (۲۴)۔ بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل کی یہی وہ تفریق ہے جس کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ غیر بنی اسرائیل کے ساتھ اگر بد دیانتی کر لی جائے تو اس کا کچھ مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ (۳/۷۵)۔ یہ تفریق خدا کے اس تصور پر مبنی ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کا خدا ہے اور بنی اسرائیل اس کی چہیتی اولاد ہے۔

عیسائیوں نے اپنے لئے جس "خدا" کو بطور معبود تجویز کیا اس کی کیفیت عجیب ہے۔ اس کی رو سے ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر گنہگار ہوتا ہے ـــــ اپنے کسی قصور کی وجہ سے نہیں۔ اس کے اوّلیں ماں باپ نے جو گناہ کیا تھا، اس کی پاداش میں ـــــ یعنی اس خدا کی عدالت ایسی ہے کہ اس میں بے گناہوں کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔ اور مجرم بھی ایسا کہ وہ ہزار کوشش کرے، اس کلنک کا ٹیکہ اس کے ماتھے سے اتر ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد، اس خدا کے متعلق یہ تصور قائم کیا گیا کہ جب اس نے دیکھا کہ تمام انسان گنہگار پیدا ہو رہے ہیں اور گنہگار ہی مرتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں وہ بالکل بے بس ہیں، تو اسے اپنی مخلوق کی اس بے چارگی پر ترس آگیا۔ اور اس نے ان کی حالت پر رحم کھا کر، اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے دی تاکہ اس کا خون ان لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ جو لوگ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آئیں، ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جو ایسا نہ کریں وہ اپنے اوّلیں ماں باپ کے گناہ کی پاداش میں جہنم میں دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ خدا کے اس تصور میں، قانون کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ نہ انسان کے جہنم رسید ہونے میں اس کے اعمال کو کوئی دخل ہے۔ نہ اس سے نجات ملنے میں کسی عمل کا کوئی واسطہ۔ چنانچہ سینٹ پال، افسیوں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

تم کو ایمان کے وسیلے ہی سے نجات ملی ہے۔ اور یہ تمہاری طرف سے نہیں۔ خدا کی بخشش ہے۔ نہ اعمال کے سبب سے ہے۔ (افسیوں ۲/۸-۹)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں۔

جتنے لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں، وہ لعنتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راست باز نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ راست باز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں ۔ ۔ ۔ مسیح جو ہمارے لئے (معاذ اللہ) لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑا دیا۔ (گلتیوں ۳/۱۰-۱۳)

اس قسم کے خدا کے تصور نے، عیسائی اقوام کی تمدنی زندگی پر جو اثر ڈالا، اس کے متعلق ہسپانیہ کا نامور پروفیسر (DR. F. DE GRACIA) کے الفاظ سنئے جنہیں بریفو (BRIFFAULT) نے اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

عیسائیت میں عدل کا تصور نہیں

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے

باہر کی چیز ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم کی طرف سے ہمیشہ چشم پوشی کی ۔ ۔ ۔ ۔ سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانے کا معائنہ کرتا ہے جو دُنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے اور گنہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن اُسے اس ظلم و استبداد کا احساس تک نہیں ہوتا جس پر اس جہنم کا قیام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔

(صفحہ ۳۳۲-۳۳۳)

چونکہ نجات کا دارومدار حضرت مسیحؑ کے کفارہ کے عقیدہ پر ٹھہرایا گیا کہ انسان کے اپنے اعمال پر اس لئے عیسائی معاشرہ میں ہر قسم کا جھوٹ اور فریب دہی، کارِ ثواب سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ سینٹ پال رومیوں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوتی ہے تو پھر مجھ پر گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے۔ اور ہم کیوں بُرائی نہ کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو۔ (رومیوں کے نام ۳:۷)

جب اس طرح معاشرہ میں برائیاں عام ہونے لگیں اور جھوٹ اور فریب کے بازار کھل گئے، تو انہیں بخشوانے کے لئے معافی ناموں کے خریدنے کا عقیدہ وضع کیا گیا۔ ان کی ابتداء یوں ہوئی کہ صلیبی جنگوں کے دوران میں، پوپ اربن دوم (URBAN - II) نے حکم جاری کیا کہ جو لوگ بذاتِ خود شریکِ جنگ نہیں ہو سکتے، وہ اپنی طرف سے کسی اور کو بھیجدیں اور اس کے بدلے میں انہیں معافی نامہ دے دیا جائے گا جو ان کی نجات کا کفیل ہوگا۔

معافی نامے

جب پوپ (LEO - X) نے روما میں سینٹ پیٹر کا گرجا بنوانا چاہا تو اس نے بھی اسی قسم کے معافی نامے بیچنے شروع کر دیئے۔ بس پھر کیا تھا؟ ان معافی ناموں نے عام تجارت کی شکل اختیار کر لی اور ہر جگہ ان کی فروخت کے لئے ایجنسیاں قائم ہو گئیں۔ ہر گناہ کی معافی کے لئے الگ قیمت کا معافی نامہ موجود تھا۔ ان معافی ناموں کی عام فارم یہ ہوا کرتی تھی۔

تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ تمہیں اپنے مقدس ترحم خسروانہ سے تمام گناہوں کی پاداش سے آزاد کر دے۔ میں اس کی، اور اس کے بابرکت شاگرد، پطرس۔ پولوس، اور مقدس پوپ کی اس سند کی رُو سے جو مجھے انہوں نے عطا فرمائی ہے تمہیں آزاد کرتا ہوں، سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے خواہ وہ کسی شکل میں ہوں۔ پھر تمہارے ہر قسم کے گناہ، حد درشکنی اور زیادتی سے، خواہ وہ کیسے ہی مہیب اور شدید کیوں نہ ہوں۔ اور میں وہ سزائیں جو تمہیں اٹھا لینا ہوں جو تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی تاکہ جب تم مرو تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں اور جنت کی راہیں کشادہ باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام پر ۔ ۔ ۔ ۔ تم بارہ پینیں کے عوض اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو، کیا تم ایسے ناخلف ہو کہ اپنے باپ کے لئے اس قدر سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے۔ اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں، فقط ایک کوٹ ہے تو وہی اتار دو تاکہ اس قدر گراں بہا متاع خرید سکو۔" (حوالہ کے لئے دیکھئے BUCK'S THEOLOGICAL DICTIONARY INDULGENCES)

برادرانِ عزیز! آپ اس داستان سے گھبرا نہ جائیے کہ دوسروں کے تصورات سے ہمیں کیا واسطہ۔ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہی تصورات کس طرح آپ کے ہاں بھی اسلام کا جزو بن گئے۔

مجوسیوں کا معبود

مجوسیت میں خدا کا تصور ایک مستبد، مطلق العنان، ڈکٹیٹر کا سا ہے جو قہر مانیت کا مجسمہ ہے، ایک عظیم تخت پر بیٹھے، جس قسم کے جی میں آئے، احکام نافذ کرتا رہتا ہے۔ اس کے اردگرد مقربین کی جماعت رہتی ہے جسے اس کے مزاج میں خاصا دخل ہوتا ہے۔ وہ سفارش کر کے، مجرمین کو چھڑا دیتے ہیں اور رشوت لے کر بے گناہوں کو پھنسا دیتے ہیں۔ عام انسانوں کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ انہیں اپنی درخواستیں، اس کے حاجب و دربان کے گروہ کی وساطت سے بھیجنی پڑتی ہیں اور وہ اس کے لئے خاصے نذرانے وصول کرتے ہیں۔ اس کے فیصلوں کے لئے نہ کسی قاعدے کی ضرورت ہے نہ قانون کی۔ نہ وہ کسی آئین کا پابند ہے نہ ضابطہ کار۔۔۔۔۔ خدا کے اس تصور کا نتیجہ تھا کہ ایران میں شخصی حکومت کا دور دورہ رہا۔ ان کا شاہنشاہ، اسی خدا کا زمین پر سایہ ہوتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ ان کا خدا، اس شہنشاہیت کا آسمان پر پرتو ہوتا تھا۔

آپ نے غور کیا، برادران! کہ جس قسم کا معبود کسی قوم نے اختیار کر رکھا ہو، اس قوم کی تہذیب و تمدن پر اس کا اثر کس قدر گہرا ہوتا ہے۔ یہ تمام معبود جن کا مختصر سا تعارف اوپر کرایا گیا ہے، ذہنِ انسانی کے تراشیدہ خدا تھے۔

جس قسم کا خدا اسی قسم کی تہذیب

اس میں شبہ نہیں کہ ان قوموں کی طرف وحی کی راہ نمائی آئی تھی جس نے انہیں خدا کا صحیح تصور دیا تھا، لیکن وہ وحی ان کے ہاں باقی نہ رہی اور اس کے ساتھ ہی خدائے حقیقی کا تصور بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ لہٰذا، ان کے جن معبودوں کا تعارف اوپر کرایا گیا ہے، وہ وحی کا پیش کردہ خدا نہیں تھا۔ ان لوگوں کے اپنے تصور کا خدا تھا۔ وحی کی رُو سے پیش کردہ خدا کا تصور صرف قرآن کریم میں ملتا ہے جو اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں محفوظ چلا آتا ہے اور اسی طرح محفوظ چلا جائے گا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اس میں ایک حرف کا ردوبدل بھی نہیں ہوا۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس خدا کا کس قسم کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔

قرآن کا خدا

جہاں تک خدا کی قوت، اختیار اور اقتدار کا تعلق ہے، قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ وہ لامحدود ہیں۔ ان کی حد و نہایت نہیں۔ ان کی وسعتوں کا کوئی شخص اندازہ نہیں لگا سکتا۔ یہی وہ لامحدود اختیارات ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (۱۴/۲۷) اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتا ہے وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ۔۔۔ وہ اپنے ارادے کے مطابق جو چاہے کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس نے کائنات کو پیدا تو اپنی منشاء اور مرضی کے مطابق کیا ہے لیکن اس کے نظم و نسق کے لئے اس نے قوانین وضع کر دیئے ہیں اور وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔

کائناتی قوانین

اس نے خود ہی اپنے لامحدود اختیارات پر اپنے وضع کردہ قانون کی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ قانون کے لئے قرآن کریم میں قدر کا لفظ آیا ہے جس کے معنی اندازے اور پیمانے کے ہیں؛ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳) "اللہ نے ہر شے کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں"۔

اب کائنات کی عظیم القدر مشینری اپنی پیمانوں اور اندازوں کے مطابق چلتی ہے۔ اسی کو خدا نے "سنت اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی خدا کی عادت یا روِش۔ اور اس روش کے متعلق کہہ دیا کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲)۔ تم خدا کی اس عادت یا روش میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ خارجی دنیا میں انہیں خدا کے غیر متبدل قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ غور کیجئے۔ یہ کتنی بڑی پابندی ہے جسے خدا نے خود اپنے اختیارِ مطلق پر عائد کر لیا ہے۔ قرآن کریم میں، خدا کے اپنے آپ پر پابندیاں عائد کرنے کا بیان بڑے بصیرت افروز انداز میں آیا ہے۔ عربی زبان میں کَتَبَ کے معنی ہوتے ہیں "کسی بات کو واجب قرار دینا"۔ اسے فرض ٹھہرانا۔ اس ضمن میں مؤمنین کے متعلق کہا۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳)۔ تم پر روزے واجب قرار دیئے گئے ہیں۔ یا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (۲/۱۷۸)۔ تم پر قصاص لازم قرار دیا گیا ہے۔ یہ پابندیاں خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد کی گئی ہیں۔ لیکن بعینہٖ یہی لفظ خود خدا نے اپنے متعلق بھی استعمال کیا ہے جہاں کہا ہے كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۵۴)۔ "تمہارے رب نے اپنے آپ پر رحمت کو واجب قرار دے رکھا ہے"۔ اس قدر لامتناہی قدرت اور اختیارات کے باوجود، اپنے آپ پر پابندی عائد کرنا، اسی خدا سے ممکن تھا جو اپنے اختیارات کو بھی قانون کے مطابق استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اور ان پابندیوں کے بعد کہا کہ ہم کبھی ان کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ (۸/۵۳) یہ پابندی بجائے خویش کچھ کم شدید نہیں۔ واضح رہے کہ جو پابندیاں از خود عائد کر لی جائیں ان سے اس شخص کے اختیار و ارادہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مثلاً ایک شخص کو تھانیدار حکم دیتا ہے کہ وہ ہر روز صبح، فلاں وقت پر فلاں جگہ پہنچ کر حاضری دیا کرے۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی پابندی، محکومی کہلائے گی۔ لیکن ایک شخص خود فیصلہ کرتا ہے کہ وہ ہر روز صبح، سیر کرتا ہوا فلاں مقام پر فلاں وقت پہنچا کرے گا۔ اور وہ التزاماً ایسا کرتا ہے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ اس پابندی کو محکومی نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ جو شخص اپنی زندگی خود عائد کردہ پابندیوں کے مطابق بسر کرتا ہے اور ان میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا، تو ایسے شخص کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا اصول پرست ہے۔ لہٰذا، کائنات کے نظم و نسق کے لئے قوانین وضع کر کے اس کے مطابق چلنے سے، خدا کے اختیارات پر کوئی حرف نہیں آتا۔

قانون کسے کہتے ہیں

قانون (یا LAW) کسے کہتے ہیں؟ اسے انگریزی زبان کے تین لفظوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی :-

IF —— THEN —— ALWAYS

یعنی اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اور ہمیشہ وہی نتیجہ نکلے گا۔ بالفاظِ دیگر قانون کے معنی یہ ہیں کہ اس کی رو سے، ہر عمل کا نتیجہ متعین ہوتا ہے جب بھی وہ عمل سرزد ہوگا، وہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ اسی کو عدل کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ، اس سے متعلق قانون کے مطابق مرتب ہوتا —— گندم از گندم بروید جو ز جو —— قانونِ فطرت اور نظامِ عدل کی صحیح تفسیر ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جسے قرآن نے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم اس تصور کے مطابق خدا پر ایمان لاؤ تو اسے خدا

خدا پر ایمان

پر ایمان سمجھا جائے گا۔ اگر خدا کے متعلق تصور کچھ اور ہے تو قرآن اسے ایمان باللہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں سے، خواہ وہ اپنے اپنے طور پر خدا کو مانتے

ہی کیوں نہ ہوں، خدا پر از سرِ نو ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ - فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷) - اگر یہ لوگ خدا پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو، تو پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر ہیں - اسی سے ضمناً یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ یہ جو آج کل نعرہ لگایا جاتا ہے کہ (BELIEVERS IN GOD UNITE TOGETHER) قرآن کی رُو سے وہ کس قدر فریب انگیز ہے - قرآن کریم کی رُو سے (BELIEVER IN GOD) صرف وہی لوگ سمجھے جا سکتے ہیں جو خدا کے متعلق وہ تصور رکھیں جسے اس نے خود اپنے متعلق دیا ہے اور جو قرآن کے اندر محفوظ ہے - یہ تصور کیا ہے ؟ دو لفظوں میں یہ کہ کائنات میں خدا کی حکمرانی ایک آمرِ مطلق (ABSOLUTE DICTATOR) کی سی نہیں - بلکہ ایک ایسے حاکم کی ہے جو ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق کرتا ہے اور اس کے خلاف کبھی نہیں کرتا - اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ کائنات میں ہر عمل کا نتیجہ وہی مرتب ہوتا ہے جو متعلقہ قانون کی رُو سے اس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے - خارجی کائنات میں خدا کے یہ قوانین از خود جاری و ساری ہیں - لیکن انسانوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو اپنی زندگی ان قوانین کے مطابق بسر کریں اور چاہیں تو ان کے خلاف روش اختیار کر لیں - وہ جونسی روش اختیار کریں گے، اس کے مطابق نتائج مرتب ہوں گے، یعنی جس طرح، خدا نے قوانین کی رُو سے، از خود اپنے اختیارات پر پابندی عائد کر لی، اسی طرح انسانوں کو بھی چاہیئے کہ اپنی مرضی سے، اپنے اختیارات کو ان قوانین کی حدود کے اندر رکھیں جو خدا نے ان کے لئے مقرر کر دیئے ہیں - معاشرہ میں اصلاح اسی صورت میں ممکن ہے کہ افرادِ معاشرہ، قانون کی پابندی پر رضا و رغبت کریں - یہی وجہ ہے جو اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں بار بار کہا ہے کہ ہم نے ضابطہ قوانین عطا کر دیا ہے - فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) - "سو جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرے - جو چاہے اس سے انکار کر دے" - رسول اللہ سے واضح الفاظ میں کہا گیا کہ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا - أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۱۰/۹۹) "کیا تو ان لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتا ہے ! اگر زبردستی مومن بنانا مقصود ہوتا تو خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ وہ صاحبِ ایمان ہوتے - لیکن انسانوں کو جبراً مومن بنانا خدا کی مشیت کے خلاف تھا - اس نے انسانوں کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے - وہ ان سے ان کی یہ خصوصیت چھیننا نہیں چاہتا - انسان، شرفِ انسانیت اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی پابندی اپنے اختیار و ارادے سے کرے - (واضح رہے کہ معاشرہ کو شر پسند عناصر کی تخریب کاریوں سے محفوظ رکھنے کا سوال الگ ہے) -

لاک نے کہا تھا کہ جس قسم کا خدا کوئی قوم اپنے لئے تجویز یا اختیار کر لے، اسی قسم کا اس قوم کا معاشرہ ہوگا - آپ سوچئے کہ جب کوئی قوم اس خدا کو اپنا الٰہ مان لے گی جس کے ہاں حکومت قانون کی ہے، اس قوم کے معاشرہ میں بھی کس طرح قانون کی حکومت کارفرما ہوگی - آیئے ہم دیکھیں کہ نظامِ کائنات میں خدا کے قانون کی حکومت کس طرح کارفرما ہے تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ اس قسم کے خدا پر ایمان رکھنے والی قوم کا معاشرہ کس قسم کا ہوگا -

کائنات میں یہ قانون کی حکومت کس طرح کارفرما ہے، اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے — آگ میں انگلی ڈالئے تو وہ جل جاتی ہے اور اس کے جلنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے - یہ فطرت کا قانون ہے - اب

دیکھئے کہ یہ قانون کس طرح کارفرما ہوتا ہے۔

کائناتی نظامِ عدل

(۱) اگر آپ لوگوں کے سامنے آگ میں انگلی ڈالیں گے تو بھی وہ جل جائے گی اور اگر کسی کمرے کی تنہائیوں میں ـــــ یعنی جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو ـــــ ایسا کریں گے، وہ تب بھی جل جائے گی۔ بالفاظ دیگر، اس جرم کی سزا کے لئے نہ کسی گواہ کی ضرورت ہوگی۔ نہ پولیس یا خارجی عدالت کی۔

(۲) یہ بھی نہیں ہوگا کہ اگر آپ اس کا اقرار کریں کہ میں نے واقعی آگ میں انگلی ڈالی تھی، تو آپ کو درد ہو۔ اور اگر اس جرم کے ارتکاب سے انکار کر دیں تو آپ اس تکلیف سے بچ جائیں۔ اس جرم کی سزا بہرحال آپ کو مل کر رہے گی۔

(۳) اگر آپ چاہیں کہ کسی کو ہزاروں روپے بطور رشوت دے کر اس سزا سے بچ جائیں، تو ایسا کبھی نہیں ہوسکیگا۔

(۴) یا آپ کسی بڑے سے بڑے صاحبِ اختیار ـــــ حتیٰ کہ صدر مملکت تک ـــــ کی سفارش لے آئیں، تو بھی آپ اس تکلیف سے نہیں بچ سکتے۔

(۵) نہ ہی ایسا ہوسکتا ہے کہ آگ میں انگلی آپ ڈالیں اور درد کسی اور کے ہونے لگ جائے۔ یا اگر آپ کا کوئی عزیز ترین دوست اور غمخوار بھی چاہے کہ آپ کے اس درد کو بٹا لے تو ایسا کبھی نہیں ہوسکے گا۔

انسانی نظامِ عدل

اس کے برعکس، آپ یہ دیکھئے کہ انسانوں کے نظامِ عدل میں بالعموم ہوتا کیا ہے؟ اس میں ہوتا ہے کہ

(۱) اگر آپ کسی ایسی جگہ ارتکابِ جرم کرتے ہیں جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، تو آپ اس جرم کی سزا سے بچ جاتے ہیں۔

(۲) اگر آپ پولیس کی گرفت میں آجاتے ہیں لیکن کسی طرح ان پہ کوئی اثر ڈال سکتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ آپ کا چالان ہی نہ ہو اور یوں آپ اس جرم کی سزا سے بچ جائیں۔

(۳) اور اگر بات عدالت تک پہنچ جائے تو وہاں وکیلوں کی موشگافیاں گواہوں کا انحراف۔ آپ کی غلط بیانیاں یا پھر عدالت پہ (سفارش یا رشوت کے زور پہ) اثر اندازی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ بری قرار دے دیئے جائیں۔

(۴) اگر معاملہ جیل خانہ تک بھی جا پہنچے، تو وہاں بھی اس کا امکان ہے کہ چکی کی سزا آپ کو ملے اور اسے پیسے کوئی اور۔

غرضیکہ اس قسم کے نظام میں اس کا امکان ہے کہ مجرم سزا سے بچ جائے اور بے گناہ پکڑا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام کائنات کے نظامِ عدل سے مختلف اور بے حد ناقص ہے۔ لیکن قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے

قانونِ مکافات

کہ انسانوں کے وضع کردہ معاشرتی نظامِ عدل سے الگ، خود انسانوں کی دنیا میں بھی خدا کا کائناتی نظامِ عدل کارفرما ہے جو اسی طرح، بغیر کسی سقم اور نقص کے، ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرتا ہے جس طرح کائناتی نظام بلا رد و رعایت، نتائج پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

کہ انسان جو کام ایسا کرتا ہے جس کا تعلق اس کی "انسانی زندگی" سے ہو، اس کا اثر اس کی ذات پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اسی کو اس عمل (کام) کا نتیجہ کہتے ہیں۔ مثلاً آگ میں انگلی ڈالنے کا تعلق، انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کا اثر خدا کے مقرر کردہ قانونِ طبیعی کے مطابق، انسان کی طبیعی زندگی پر پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو آگ میں دھکیل دیتا ہے تو اس کے اس عمل کا تعلق اس کی انسانی زندگی سے ہے جس کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اگر وہ معاشرہ کے نظامِ عدل کی رُو سے، اس جرم کی سزا سے کسی طرح بچ بھی جائے تو بھی اس کا جو اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے وہ اس کے نتیجے سے کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ اس کے لئے خدا کا نظامِ عدل کارفرما ہے جس میں نہ کسی گواہ کی ضرورت پڑتی ہے، نہ پولیس کی۔ نہ دنیاوی عدالت کی، نہ جیل خانے کی ـــــ پھر، چونکہ انسان کی ذات، اس کے جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی، بلکہ آگے بھی چلتی ہے، اس لئے انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ رہ نہیں سکتا۔ قرآنِ کریم نے اسے، کہیں "یَوۡمُ الدِّیۡنِ" کہہ کر پکارا ہے کہیں "یَوۡمُ الۡقِیٰمَۃِ"۔ مطلب اس سے خدا کا نظامِ عدل ہی ہے۔ خواہ اس کے نتائج اس دُنیا میں سامنے آجائیں یا مرنے کے بعد، اگلی زندگی میں۔ اس نظامِ عدل کی خصوصیتِ کبریٰ قرآن نے ان چند الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ وَاتَّقُوۡا

خدا کا نظامِ عدل

یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (۲/۴۸)۔ اس نظامِ عدل میں کوئی شخص کسی مجرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکتا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آ سکتی ہے۔ نہ ہی کوئی مجرم، اپنے جرم کے معاوضہ میں کچھ دے دلا کر چھوٹ سکتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کی کسی قسم کی مدد کر سکتا ہے۔ یہ ہے خدا کے نظامِ عدل کی بنیادی خصوصیت۔

اس مقام پر اس حقیقت کو پھر دہرا دیا جانا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم جب خدا کے نظامِ عدل کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس سے مقصد محض اس نظام کا تذکرہ کرنا یا اس کی (DESCRIPTION) دینا نہیں ہوتا۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانوں سے کہا جائے کہ تم غور کرو کہ خدا کا کائناتی نظام کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اور اس کے نتائج کس قدر خوشگوار مرتب ہوتے ہیں۔ اگر تم اپنے معاشرہ میں بھی اسی قسم کا نظام قائم کرلو تو اس کا نتیجہ بھی ایسا ہی خوشگوار مرتب ہوگا ـــــ یہ نظام ان قوانین کی رو سے قائم ہوگا جنہیں قرآنِ کریم میں بیان کیا گیا ہے ـــــ

اس سے مقصد

مثلاً قرآن میں ہے کہ وَمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُہَا (۱۱/۶)۔ "دُنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے سامانِ زیست کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو"۔ یہ محض ایک واقعہ کا بیان نہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں بھی ایک نظام قائم ہونا چاہیئے جس میں ہر متنفس کے سامانِ زندگی کے مہیا کرنے کی ذمہ داری، اس نظام پر ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو قرآن نے خدائی نظامِ عمل (یَوۡمُ الدِّیۡنِ یا یَوۡمُ الۡقِیٰمَۃِ) کے متعلق جن تفاصیل کا ذکر کیا ہے، ان سے یہ کہنا مقصود ہے کہ انسانی معاشرہ میں جو نظامِ عدل قائم ہو، اس کی خصوصیات بھی ایسی ہی ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ یہ نظام بھی کس طرح اسی قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے جس قسم کے نتائج خدا کے نظامِ عدل سے مرتب ہوتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد آپ خدا کے نظامِ عدل کی موٹی موٹی خصوصیات ملاحظہ فرمائیے۔

صرف ایک حاکمِ اعلیٰ

نظامِ عدل کے قیام کے لئے پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ اُس مملکت میں، اختیار و اقتدارِ اعلیٰ صرف ایک اتھارٹی کا ہو۔ اگر اس میں ایک سے زیادہ اربابِ اقتدار ہوں گے تو نظامِ عدل کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ اس بنیادی نکتہ پر قرآن نے بڑا زور دیا ہے۔ سورۂ انفطار میں "یَوْمُ الدِّیْنِ" کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۸۲/۱۸)

تمہیں معلوم ہے کہ یوم الدین کیا ہے؟ یہ بات تمہیں خدا کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا۔

اس کے بعد ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹)

جب کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے لئے اختیار نہیں رکھے گا، اور حکم صرف ایک خدا کا چلے گا۔

سورۂ حج میں ہے۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ (۲۲/۵۶)۔ جب اقتدار صرف خدا کا ہوگا۔ اور وہی لوگوں میں فیصلے کرے گا۔ اُس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) خدا کا ہوگا اور آخری فیصلہ کرنے کا اختیار (SUPREME AUTHORITY) اس کا ہوگا۔ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲)۔ حکم صرف خدا کا چلے گا جو بلند ترین غلبہ اور اقتدار کا مالک ہے۔ وہی اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ (۹۵/۸) ہے۔ اس نظام کی رو سے ارض و سماوات سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہوں گے۔ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (۳۹/۶۷)۔

حق پر مبنی اقتدار

لیکن یہ اقتدار و اختیار، ظلم اور دھاندلی سے حاصل کردہ نہیں ہوگا بلکہ سرتاپا حق و انصاف پر مبنی ہوگا۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذِ ِۨالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ (۲۵/۲۶)۔ اس میں خدائے رحمٰن کے لئے جو اقتدار و اختیار ہوگا وہ حق پر مبنی ہوگا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ نظامِ عدل کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) مملکت میں آخری اختیار صرف ایک مرکزی اتھارٹی کو حاصل ہو — اور

(۲) یہ اقتدار، دھاندلی سے حاصل نہ کیا گیا ہو، بلکہ حق پر مبنی ہو۔ انسانوں کی دنیا میں حق کے معنی ہیں، وہ قانونِ خداوندی کی رُو سے جائز ہو۔

حکومت صرف قانون کی

لیکن یہ اختیار و اقتدار، کسی شخص یا اشخاص کی جماعت کو اپنے طور پر حاصل نہیں ہوگا۔ یہ اختیار صرف قانون کو حاصل ہوگا۔ یعنی اس نظام میں فرمانروائی صرف قانون کی ہوگی، اور جسے اوپر مرکزی اتھارٹی کہا گیا ہے اس کا کام قانون کو نافذ کرنا ہوگا۔ اپنی مرضی چلانا نہیں۔ خارجی کائنات میں یہ قانون ہر شے کے اندر از خود موجود ہے۔ لیکن انسانوں کو یہ قانون وحی کے ذریعے دیا گیا ہے اور اب اپنی مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس لئے انسانی نظامِ عدل میں خدا کی حکمرانی کے معنی ہوں

گئے اس کی کتاب کی حکمرانی۔ چنانچہ خدا نے بالتصریح کہہ دیا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)۔ جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا تو یہی لوگ کافر ہیں۔

انسانی نظامِ عدل کے جن اسقام و نقائص کا شروع میں ذکر آچکا ہے، ان کے علاوہ، اس میں ایک بہت بڑی خرابی اور بھی ہے۔ اس میں خود قانون سازی کا اختیار کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو حاصل ہوتا ہے۔

قانون سازی کا اختیار

اس کی وجہ سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاں وہ قانون ساز اتھارٹی دیکھتی ہے کہ کسی قانون سے اس کے مفاد پر زد پڑتی ہے، وہ اس قانون ہی کو بدل دیتی ہے۔ اس طرح خود قانون کے مطابق چلنے کی مدعی مملکت میں بھی عملاً لاقانونیت پھیل جاتی ہے۔ قانون کی کارفرمائی کا فائدہ اسی صورت میں ہے جب ہر شخص کو معلوم ہو کہ فلاں بات کے لئے قانون کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے اس بات پر کلی اعتماد اور بھروسہ ہو کہ یہ قانون جب جی چاہے بدلا نہیں جائے گا۔ قانون پر اسی قسم کا یقینِ محکم اور اعتمادِ کامل ہے جس سے انسان اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ لہٰذا، انسانی نظامِ عدل اسی صورت میں اطمینان بخش ہو سکتا ہے جب اس کے قوانین غیر متبدل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کے متعلق جو قرآن میں مذکور ہیں، کہہ دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)۔ "اور تیرے رب کا قانون صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ اس کے قوانین میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں"۔ یعنی اس کی طرف سے نازل کردہ ضابطۂ قوانین ہر اعتبار سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ انسانی نظامِ عدل، ان غیر متبدل قوانین کو اپنے اپنے حالات کے مطابق نافذ کرنے کے لئے، جزئی تفاصیل مرتب کر سکتا ہے۔ وہ ان اصولوں میں نہ حک و اضافہ کر سکتا ہے۔ نہ تغیر و تبدل۔ اس طرح، انسانی نظامِ عدل، خداوندی نظام سے ہم آہنگ ہو کر، اسی قسم کے غیر متبدل نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

غیر متبدل قانون

انسانی نظامِ عدل میں ایک سقم یہ بھی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف جھوٹے دعوے دائر کر دیتے ہیں۔ حکومت کسی کے خلاف کوئی کارروائی کرتی ہے تو اس کی بنیاد اس کی اپنی مشینری کی رپورٹ پر ہوتی ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن خدا کے نظامِ عدل میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس میں مجرمین کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی جائے گی وہ ہر نوع سے مکمل بھی ہو گی اور بالکل صحیح اور درست بھی۔ سورۂ کہف میں ہے: وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ ۔ اسے دیکھ کر ان کا رنگ فق ہو جائے گا۔ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۔ اور وہ کہیں گے کہ ہماری بدبختی! یہ کس قسم کی فردِ جرم ہے جس میں کوئی چھوٹی بڑی بات درج ہونے سے رہ ہی نہیں گئی۔ اس نے ہمارے تمام اعمال کا احاطہ کر لیا ہے: وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۔ اور وہ اس طرح اپنے تمام اعمال اپنے سامنے موجود پائیں گے: وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (۱۸/۴۹)۔ اس لئے کہ اللہ کسی پر ذرا بھی ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ عمل کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ مجرم کے خلاف فردِ جرم ٹھیک ٹھیک مرتب ہو۔ اس میں کسی قسم کی غلطی یا زیادتی نہ ہو۔ مقدمہ کا فیصلہ تو بہت بعد کی چیز ہے، فردِ جرم میں غلط بیانی یا زیادتی بجائے خود ایک ظلم ہے۔ فردِ جرم میں حق (سچ) کے سوا

سچی فردِ جرم

کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ خدا کے نظامِ عدل میں فردِ جرم کی یہی کیفیت ہوگی۔ اس میں مجرمین سے یہ ملاکہہ دیا جائے گا کہ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۚ اس فردِ جرم میں تمہارے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ سرتاسر حق پر مبنی ہے: اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۴۵/۲۹)۔ تم جو کچھ کرتے تھے، اسے ہم ساتھ کے ساتھ لکھ لیا کرتے تھے۔ یہ استغاثہ محض سُنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں۔ تحریری ریکارڈ پر مبنی ہے۔

غالبؔ کو شکایت تھی کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

یہ اس کی محض شوخیٔ طبع نہیں تھی۔ یہ انسانی نظامِ عدل پر رمز و کنایہ کے انداز میں سخت طنز و تنقید تھی۔ نظامِ عدلِ

خود ملزم کی مرتب کردہ فردِ جرم

خداوندی میں، فردِ جرم، نہ فرشتوں کی مرتب کردہ ہوتی ہے نہ کسی اور انسان کی، یہ خود ملزم کی مرتب کردہ ہوتی ہے۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ۔ ہر شخص کا اعمالنامہ اس کی گردن کے ساتھ لٹکا ہوا ہوتا ہے: وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا۔ فرق یہ ہے کہ ظہورِ نتائج سے پہلے، وہ اعمالنامہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ ظہورِ نتائج کے وقت اسے کھول دیا جاتا ہے۔ اور ملزم سے کہا جاتا ہے کہ

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ

تو اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لے۔ اپنی مرتب کردہ فردِ جرم، عدالت میں آپ پڑھ کر سُنا۔ اور اس کے بعد، خود ہی فیصلہ کر کہ تیری سزا کیا ہونی چاہیئے۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۴)۔ آج اپنے خلاف حساب کرنے کے لئے تو خود ہی کافی ہے۔ کسی اور حساب کرنے والے کی ضرورت ہی نہیں۔

اپنے خلاف آپ گواہی

انسانی نظامِ عدل میں اگلا قسم یہ ہوتا ہے کہ مقدمہ میں ملزم کے خلاف جھوٹے گواہ پیش کر دیئے جاتے ہیں اور بے گناہ دھر لئے جاتے ہیں۔ خدائی نظامِ عدل میں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۳۶/۶۵)۔ آج تمہیں زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تمہارے خلاف خود تمہارے ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا۔ وہاں ہر مجرم خود اپنے خلاف آپ گواہی دے گا۔ وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (۶/۱۳۰)۔ اس طرح وہاں کوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔ سب راز افشا ہو جائیں گے۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹)۔

قرآن کا منشا یہ ہے کہ اس قسم کا نظامِ عدل، انسان اپنے معاشرے میں رائج کرے۔ اس مقام پر یہ کہا جائے گا کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ نظام ایسا انتظام کرے کہ اس کی خبر رساں ایجنسیاں جھوٹی رپورٹ نہ کریں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ملزم خود اپنے خلاف شہادت دے۔ لیکن قرآن اسے ناممکن نہیں بناتا۔ وہ کہتا ہے کہ

اگر انسانوں کی صحیح تربیت کی جائے تو مجرم اپنے خلاف آپ بھی شہادت دے سکتا ہے۔ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! تم دنیا میں نظامِ عدل قائم کرو اور اس کے لئے جب کہیں شہادت کی ضرورت پڑے تو مدعی یا مدعا علیہ۔ ملزم یا مستغیث کی طرف سے گواہ بن کر نہ جاؤ بلکہ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ۔ صرف خدا کے لئے گواہی دو۔ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ۔ خواہ یہ گواہی خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا خواہ ملزم غریب ہو یا امیر۔ اس سے تمہاری گواہی پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا۔ تم سچائی سے ہٹ کر ان کے خیر خواہ بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم سے زیادہ خدا ان کا خیر خواہ ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی۔ دیکھنا اس باب میں کہیں جذبات تم پر غالب نہ آجائیں۔ ایسا بھی نہ کرنا کہ کوئی ذو معنی یا پیچدار بات کر کے اصل حقیقت کو چھپا لو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۴/۱۳۵)۔ یا شہادت دینے سے اعراض برتو۔ یاد رکھو! خدا تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ اس لئے تم دنیا والوں سے تو بات چھپا سکتے ہو۔ خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ یہی وہ ایمان ہے جس سے انسان کی ایسی تربیت ہو جاتی ہے کہ وہ سچی سچی شہادت دے، خواہ وہ اس کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام میں، جس میں ہر بات ٹھیک ٹھیک سامنے آجائے حتّٰی کہ مجرم خود اپنے خلاف آپ گواہی دیتے دے۔ کسی وکیل کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔

وکیل کی ضرورت نہیں

وکیل کی ضرورت تو غلط نظامِ عدل میں پڑتی ہے۔ نظامِ خداوندی میں اس کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے اس قسم کے وکیلوں سے کہا کہ تم دنیاوی نظام میں تو مجرمین کی طرف سے جھگڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہو، لیکن فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰہَ عَنْھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا (۴/۱۰۹)۔ خدا کے نظامِ عدل میں، فیصلے کے وقت، مجرمین کی طرف سے اللہ سے جھگڑنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ نہ ہی کوئی ان کا وکیل بن سکے گا۔

اب اس کے بعد اگلا مرحلہ آتا ہے جس میں عدالت کو کسی طرح متاثر کر دیا جاتا ہے کہ وہ مجرم کے حق میں فیصلہ دے دے۔ خدا کے نظامِ عدل میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ وہاں نہ کسی کی سفارش چل سکتی ہے نہ رشوت۔ نہ ہی کوئی فدیہ دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے۔ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا۔ اس دن کو ہمیشہ نگاہ میں رکھو اور اپنے بچاؤ کی شکل پیدا کر لو جب کوئی شخص کسی دوسرے کے کام نہیں آسکے گا۔ وَلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ۔ نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْھَا عَدْلٌ نہ کوئی معاوضہ دے کر چھوٹ سکے گا۔ وَّلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)۔ نہ کوئی شخص مجرم کا حامی و مددگار ہوگا ـــــ دوسری جگہ ہے: یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ (۲/۲۵۴)۔ جس دن نہ انصاف بک سکے گا۔ نہ کسی کی دوستی یا سفارش کام آسکے گی۔ نہ باپ بیٹے کے کام آسکے گا نہ بیٹا باپ کے یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ

هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا (۳۳/۳۱)۔ اس دن نہ کسی کی دولت اس کے کام آسکے گی۔ نہ اولاد۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۸۸/۲۶) غرضیکہ اس نظام میں اصول یہ ہوگا کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۱۶۵/۶) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ جس نے کوئی اچھا کام کیا ہوگا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جس نے جرم کیا ہوگا اس کی سزا بھی وہ خود بھگتے گا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲۸۶/۲) اور اس قانون میں نہ کوئی استثناء ہوگی نہ کسی کی رعایت۔ حتیٰ کہ اگر (بالفرضِ محال) خدا کا رسول بھی، قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرے تو اسے بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ سورۂ زمر میں رسول اللہ سے کہا گیا کہ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۳/۳۹)۔ تم اس کا اعلان کر دو کہ اگر میں بھی اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں یومِ مکافات سے ڈرتا ہوں۔ اس دن کا عذاب بڑا سخت ہوگا۔ اور اس میں میری بھی کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

رسول کی بھی رعایت نہیں ہوگی

نظامِ عدل کو ہونا ہی ایسا چاہیئے جس میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تمیز نہ ہو۔ نہ کسی کے ساتھ رعایت کی جائے۔ نہ کسی سے زیادتی۔

اس نظامِ عدل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ کسی سے کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ یہ نظامِ عدل صرف جرائم کی سزا دہی تک محدود نہیں ہوگا۔ انسان کے ہر اچھے یا بُرے عمل کا صحیح صحیح نتیجہ مرتب کرنے کے لئے قائم کیا جائے گا۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ اس دن عدل کا ترازو کھڑا کیا جائے گا فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا اور کسی شخص پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا۔ اگر کسی کا کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے اس کے سامنے لے آئیں گے۔ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (۴۷/۲۱)۔ اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے۔ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ (۱۷/۴۰)۔ اس دن ہر متنفس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ اور کسی کے خلاف کوئی ظلم اور ناانصافی کی بات نہیں ہوگی یہ قرآن کریم کے ایک دو نہیں، سینکڑوں مقامات میں مختلف انداز میں مذکور ہے (مثلاً ۱۱۱/۱۶ ز ۳۱/۱۶ وغیرہ) قرآن کی پوری تعلیم اسی مرکز کے گرد گردش کرتی ہے۔ یہی اس کے پیغام کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یہی وہ بنیادی اینٹ ہے جس پر اس کے نظام کی ساری عمارت استوار ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۷-۸/۹۹) جس کے نامۂ اعمال میں، ذرہ برابر بھی کوئی عمل خیر ہوگا، وہ اس کا نتیجہ بھی اپنے سامنے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ایک ذرہ برابر کوئی خراب کام کیا ہوگا، اس کا نتیجہ بھی اس کے سامنے آجائے گا۔ اور پھر اس کا مقام متعین کرنے کے لئے، ان دونوں پلڑوں کا موازنہ کیا جائے گا۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ۔ جس کا تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا ہوگا وہ کامیابی و کامرانی کی زندگی بسر کرے گا۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (۹-۶/۱۰۱)۔ اور جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا، وہ تباہیوں کے جہنم میں جائے گا۔ یہ ہے وہ صحیح معیارِ عدل جس کے مطابق نظامِ خداوندی میں افراد کے مقامات کا تعین ہوگا۔ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ یہی معیار، انسانوں کے نظامِ معاشرہ میں بھی مقرر کیا جائے۔ نہ کسی کا کوئی

(MERIT) بلا معاوضہ (UN - REWARDED) رہ جائے، نہ کوئی مجرم، اپنے کئے کی سزا بھگتنے سے بچ سکے۔

مجرم الگ ہو جائیں

اور یہ کچھ اس طرح کھلے اور نکھرے طور پر ہو کہ معاشرہ میں شریف اور بدمعاش چھٹ کر الگ الگ ہو جائیں تاکہ کوئی شخص کسی کے متعلق دھوکے میں نہ رہے۔ خدا کے نظامِ عدل میں یہی صورت ہوتی ہے۔ وہاں عملاً یہ شکل سامنے آجاتی ہے کہ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ‎ (۳۶/۵۹) - مجرم، باقی معاشرہ سے الگ ہو جاتے ہیں۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ۔ وہ اپنی علامات سے پہچانے جاتے ہیں۔ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ (۵۵/۴۱)۔ اور جھٹ قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ ایسے نظامِ عدل میں معاشرہ کو نہ انہیں پہچاننے میں کوئی دقت ہوگی۔ نہ گرفتار کرنے میں کوئی دشواری۔ اس میں مجرم کو کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔ ہر شریف آدمی دُور سے پکار اٹھے گا کہ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ (۲۸/۱۷) میں کبھی مجرموں کی پشت پناہ نہیں بن سکتا۔ اس طرح، زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پہ تنگ آجائے گی۔ حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ (۹/۱۱۸)۔ بلکہ وہ خود اپنے جرم کی سزا پانے کے لئے حاضرِ عدالت ہو جائیں گے، اس لئے کہ انہیں یقین ہو جائے گا کہ اس (عدالت) کے سوا انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ (۹/۱۱۸)۔ اب یہ عدالت کے دیکھنے کی چیز ہوگی کہ جرم کی نوعیت اور مجرم کی نفسیاتی کیفیت کیا ہے۔

معافی کی گنجائش

اگر وہ سہو و خطا کا نتیجہ ہے اور عمداً اور عادۃً سرزد نہیں ہوا۔ اور مجرم اپنی لغزش پر نادم ہے اور اس میں آیندہ کے لئے اصلاحِ حال کا امکان۔ تو وہ اسے معاف بھی کر دے گی۔ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۹/۱۱۸) خدا کے نظامِ عدل میں، ایسے حالات میں توبہ اور عفو کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ نظامِ خداوندی میں توبہ اور عفو سے مراد یہ ہے کہ مجرم اس کے بعد اس قدر تقویت بخش، صلاحیت آمیز، تعمیری کام کرے کہ خلاف ورزیِ قانون سے جس قدر نقصان، کسی دوسرے فرد، یا معاشرہ، یا خود اس کی اپنی ذات کا ہوا ہے اس کی تلافی بھی ہو جائے اور آئندہ کے لئے ایسے اقدام سے رُک جانے کی قدرت بھی۔ اسی کو مغفرت کہتے ہیں۔ اگر کسی پودے کو کیڑا لگ جائے تو اس کی نشو و نما رک جاتی ہے۔ لیکن اگر اسے سامان پرورش زیادہ بہم پہنچا دیا جائے اور کیڑوں سے اس کی رکھوالی کر لی جائے تو اس سے وہ کمی بھی پوری ہو جاتی ہے جو اس کی نشو و نما میں واقع ہو گئی تھی، اور اس کے بعد وہ مزید نشو و نما بھی حاصل کر لے گا۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۵)۔ سے یہی مراد ہے۔ یعنی حسن و توانائی پیدا کرنے والے کام خرابیاں پیدا کرنے والے کاموں کے مضر اثرات کو زائل کر دیتے ہیں۔ انسانی نظامِ عدل میں، اس طرح کا انتظام ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

یہ ہے خدا کے نظامِ عدل کا وہ نقشہ جسے قرآن نے اس لئے پیش کیا ہے کہ انسان اپنے معاشرہ میں بھی اسی انداز کا نظامِ عدل قائم کرے۔ سوچئے کہ جس معاشرہ میں ایسا نظامِ عدل قائم ہو جائے اس میں قانون کے مطابق چلنے والوں کی زندگی کیسی جنت در آغوش ہو جائے گی۔ یہی قرآن کا مقصود ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ یعنی وہ خدا جس کا ہر کام قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے اور جس کا نظام یکسر عدل پر مبنی ہے۔

رحم کا تصوّر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں عدل کے ساتھ رحم بھی تو ہے (کیونکہ خدا رحیم ہے) قانون کے ساتھ رحم کا جوڑ کس طرح ہو سکتا ہے؟ قرآن کی رو سے، عدل کے ساتھ رحمت ہے۔ رحم نہیں۔ اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ رحم ایک جذباتی چیز ہے جو کسی پر ترس کھا کر ظہور میں آتی ہے۔ اس کا واقعی قانون اور عدل سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت نے جب نجات کا مدار رحم پر رکھا تو اسے قانون اور عدل کے تصور سے یکسر دامن کش ہونا پڑا۔ عیسائیت میں رحم کے معنی یہ ہیں کہ جب خدا نے دیکھا کہ ہر انسان پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کی یہ آلودگی، اعمال کے ذریعے کسی صورت میں بھی دور نہیں ہو سکتی، تو اسے اپنے بندوں پر رحم آیا۔ اس کے لئے اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دی تاکہ وہ انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے اور ان کی نجات ہو جائے۔

رحمت کا تصور اس سے مختلف ہے اور وہ قانون ہی کا ایک گوشہ ہے۔ آپ پہلی مثال کو پھر سے سامنے لائیے۔ آپ نے آگ میں انگلی ڈال دی اور وہ جل گئی۔ اس سے آپ کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ لیکن جس خدا نے آگ

رحم اور رحمت میں فرق میں یہ تاثیر رکھی ہے، اس نے ایسی دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں جن سے جلن کی تکلیف دور ہو جاتی ہے اور زخم بھی مندمل ہو جاتا ہے، اگر آپ ان دوائیوں کی طرف رجوع کریں گے تو آپ کی تکلیف رفع ہو جائے گی۔ یہ رحمت خدا کے ایک اور قانون ہی کی طرف ہے جو ہر ایک کے لئے عام ہے۔ یعنی جو شخص بھی اس قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرے گا اس سے نفع یاب ہو جائے گا۔ آگ کے ساتھ اس قسم کی دوائیوں کا پیدا کر دینا، خدا کی رحمت ہے۔ رحمت کے معنی ہیں نرمی اور رأفت سے سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ یہ رحم کا وہ جذبہ نہیں جو کسی پر ترس کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا، انسانی جذبات سے بلند اور منزّہ ہے۔

اسلامی مملکت یہ تھا خدا کا وہ تصور جسے قرآن کریم نے پیش کیا۔ اس خدا پر ایمان رکھنے والی قوم نے ایک مملکت قائم کی جس کے اوّلیں سربراہ خود نبی اکرمؐ تھے۔ حضورؐ نے اس مملکت کا جو منشور جاری فرمایا اس کے سرفہرست یہ انقلاب آفریں اعلان تھا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)۔

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا سے ضابطہ قوانین، حکومت، حتیٰ کہ نبوت تک بھی دے دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم قانونِ خداوندی کی نہیں بلکہ میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب اللہ کے اس ضابطہ قوانین کی رُو سے ربانی بن جاؤ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اس کی تعلیم کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے رہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ عظیم اعلان کس طرح دنیا میں قانون کی حکومت قائم کرنے کا دستور اساسی بنتا ہے۔ اس کے بعد، خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ لوگ تمہارے پاس اپنے متنازعہ فیہ معاملات لے کر آئیں گے، فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ

بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ (۵/۴۸) - ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو - رسول اللہ کو اس ضابطۂ قوانین میں ردّ و بدل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ "حزبِ مخالف" کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوتا ہے کہ اس ضابطہ قوانین کی جگہ دوسرا ضابطہ لے آؤ۔ اَوْ بَدِّلْہُ۔ یا اس میں کچھ تغیر و تبدل کر دو۔ تاکہ باہمی مفاہمت کی شکل پیدا ہو سکے۔ آپ کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا تھا کہ مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ ج اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ج (۱۰/۱۵) یہ بات میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اس ضابطہ قوانین میں اپنی طرف سے کچھ ردّ و بدل کر دوں۔ میرا فریضہ تو اس کا اتباع کرنا ہے۔ نہ کہ اس میں ردّ و بدل کرنا۔ ردّ و بدل کرنا تو ایک طرف اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵)۔ اگر میں بھی اس کے کسی حکم نون کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی اس کی سزا ملے گی۔

واضح رہے کہ یہ جو اوپر کہا گیا ہے کہ "حزبِ مخالف" کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ پیش ہوتا تھا تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسلامی مملکت کی پارلیمان میں ایک حزبِ اقتدار (RULING PARTY) ہوتی تھی اور دوسری حزبِ مخالف (OPPOSITION) قطعاً نہیں۔ اسلامی مملکت میں ساری اُمّت ایک جماعت (پارٹی) ہوتی ہے۔ اُمّت کے اندر پارٹیوں کے وجود کا تصور غیر قرآنی اور حکمتِ فرعونی پر مبنی ہے۔ قرآن کی رو سے دنیا میں دو ہی پارٹیاں ہیں ایک امتِ مسلمہ اور دوسرے تمام غیر مسلم۔ یعنی نظامِ خداوندی کی مخالف جماعتیں۔ اسی کو ہم نے "حزبِ مخالف" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی محمدؐ رسول اللہ کی پارٹی کے مقابلہ میں ابوجہل اور ابولہب کی پارٹی۔ یہ مطالبہ انہی کی طرف سے تھا۔

قانون اور شخصیت کی اطاعت میں فرق

اب آگے بڑھئے۔ اس مملکت میں، قانون کی اطاعت اور شخصیتوں کی اطاعت کا فرق کس قدر بین اور واضح تھا، اس کے لئے سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تو معمولی سا ہے لیکن نتیجہ کے اعتبار سے بڑا اہم اور دور رس۔ مدینہ میں ایک لونڈی تھی بریرہ نامی۔ وہ اپنے مالک سے ناراض ہو کر الگ ہو گئی۔ اس شخص کے کہنے پر آپ نے بریرہ سے کہا کہ تم اس کے پاس چلی جاؤ۔ ذرا فریقین کی پوزیشن کو سامنے رکھئے۔ کہنے والے ہیں محمد رسول اللہؐ۔ اسلامی مملکت کے واحد فرمانروا۔ مدینہ کے حاکم۔ اور کہا جا رہا ہے ایک لونڈی سے۔ کیا اس لونڈی کی جرأت ہو سکتی تھی کہ سامنے سے لب کشائی کر سکے۔ لیکن وہاں تو تربیت ہی ایسی دی گئی تھی کہ لونڈیاں تک قانون اور شخصیت میں فرق کرنا سمجھ گئی تھیں۔ بریرہ نے کہا کہ حضورؐ! آپ کا یہ حکم وحی کی رو سے ہے یا اپنا ذاتی ارشاد ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ میری اپنی سفارش ہے۔ اس پر بریرہ نے کہا کہ پھر آپ معاف فرمائیے ـــــ میں اپنے معاملات کو خود بہتر سمجھتی ہوں ـــــ اور آپؐ تبسم فشاں تشریف لے گئے۔

اور یہی تھے وہ رسولؐ جنہوں نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحہ میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ

اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔

اس لئے کہ قانون کی کارفرمائی میں کسی کی سفارش کا کیا دخل؟

حکومت کے اس نہج پر حضورؐ کے سچے جانشینوں (رضی اللہ عنہم) نے بھی برقرار رکھا اس لئے کہ وہ بھی اُسی خدا

خلافتِ راشدہ

پہ ایمان رکھتے تھے جس نے قانون کا احترام سکھایا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ مملکت کے سربراہ ہوتے ہوئے یہ خود عدالتوں میں مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوتے تھے اور اگر کبھی ایسا نظر آتا کہ جج نے انہیں مدعی کے برابر نہیں رکھا بلکہ کچھ تعظیم کی ہے تو درخواست دے کہ مقدمہ کسی اور عدالت میں منتقل کرا لیتے کہ جو جج فریقین میں ذرا سا امتیاز بھی ملحوظ رکھتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سے فیصلہ میں بھی کچھ رعایت ہو جائے۔ قانون کے دائرے سے نہ یہ خود باہر تھے نہ ان کے بیوی بچے۔ اگر انہیں دوائی کے لئے شہد کی ضرورت پڑتی اور شہد بیت المال میں موجود ہوتا تو اس کے لئے کیبنٹ کی منظوری حاصل کرتے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا بیٹا مملکت کی چراگاہ میں اپنا اُونٹ چراتا رہا جس سے وہ اونٹ فربہ ہو گیا اور اس نے اسے منافع پر بیچ دیا۔ باپ کو علم ہوا تو انہوں نے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ تمام زر منافع بیت المال میں داخل کرو۔ تم نے مملکت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ کس کی اجازت سے چرایا؟ ایک دفعہ مصر کے گورنر حضرت عمر بن عاصؓ کے بیٹے محمد نے ایک مصری کے تازیانے مارے۔ وہ تازیانے مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "میں بڑوں کی اولاد ہوں۔ اس لئے تمہیں تازیانے لگا سکتا ہوں"۔ جب اس کی شکایت حضرت عمرؓ کے کانوں تک پہنچی تو آپ نے حضرت عمر بن عاصؓ۔ اور ان کے بیٹے کو طلب کر لیا اور اس مصری کے ہاتھ میں تازیانہ دے کر کہا کہ "لے! بڑوں کی اولاد کو مار" تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ قانون کی نگاہ میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی امتیاز نہیں۔ جب وہ اُسے تازیانے لگا چکا تو آپ نے اس سے کہا کہ اس کے باپ (یعنی مصر کے گورنر) کے سر پر بھی دو چار لگاؤ۔ اس لئے کہ اس کا بیٹا تمہیں کبھی نہ مارتا جب تک اسے باپ کی گورنری کا گھمنڈ نہ ہوتا۔ آپ نے حضرت عمر بن عاصؓ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "عمر! تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا ہے۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"۔

یہ تو رہی قانون کی پابندی۔ وہاں کیفیت یہ تھی کہ جو بات یونہی طے پا جاتی، اس کی پابندی بھی شدت سے کی جاتی تھی اس کے لئے اس واقعہ کو سامنے لائیے کہ جب آپ شام کے سفر کے لئے گئے ہیں تو سواری کا ایک اُونٹ تھا اور طے یہ پایا تھا کہ آپ اور آپ کے ملازم اس پر باری باری سوار ہوں۔ جب منزل ختم ہوئی اور عیسائی حکومت کے نمائندے استقبال کے لئے آئے تو حالت یہ تھی کہ ملازم اُونٹ پر سوار تھا اور خلیفۃ المسلمین مہار تھامے آگے آگے چل رہے تھے۔ اس لئے کہ اس وقت سوار ہونے کی باری ملازم کی تھی ـــــ یہ سب کیا تھا؟ اس خدا پر ایمان کا کرشمہ جس نے کہہ دیا تھا کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ تم خدا کی روش میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ اور لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ اس کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

مسلمانوں میں شخصی حکومت

اس کے بعد بدقسمتی سے مسلمانوں میں شخصی حکومت آگئی تو قانون کا تصور ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ شخصی حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس میں قاعدہ اور قانون کوئی نہیں ہوتا۔ سب کچھ فرمانروا کی مرضی پر موقوف ہوتا ہے۔ سعدی کے الفاظ میں بادشاہوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ـــ گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت بنخشند۔ کبھی کسی کے سلام کرنے پر مزاج کا پارہ چڑھ گیا تو اسے اور اس کے بال بچوں کو لہو میں نہلوا دیا۔ اور کبھی کسی کے گالی دینے پر خوش ہو گئے تو گاؤں جاگیر میں بخش دیا۔ پھر ان کے دربار میں یہ کیفیت ہوتی کہ دور دور تک حاجب و دربان پھیلے

ہوتے اور کسی فریادی کو ان تک براہِ راست پہنچنے کا یارا نہ ہوتا۔ اس کے بعد مقربین بارگاہِ عالیہ کا ایک گروہ ہوتا جنہیں بادشاہ سلامت کے مزاج میں بڑا دخل ہوتا۔ وہ مجرم کی سفارش کرتے تو پھانسی کا رسّہ اس کی گردن سے نکال دیا جاتا۔ کسی بے گناہ کے خلاف ہو جاتے تو اسے حوالۂ دار و رسن کر دیا جاتا۔ بادشاہ کے دربار میں قصیدے پڑھے جاتے۔ اس کے حضور نذرانے پیش کئے جاتے۔ مقصد اس تمام کاروبار سے بادشاہ سلامت کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا۔

جب زمین پر اس قسم کے حاکمِ مطلق کی فرمانروائی تسلیم کر لی گئی تو آسمان پر خدا کا تصور بھی اسی قسم کا قائم کر لیا گیا اس لئے کہ ان کے ہاں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے جس

خدا کا بگڑا ہوا تصوّر

قسم کا زمین پر سایہ، اُسی قسم کا عرش پر اصلی بادشاہ۔ نہ یہاں کسی قاعدے اور قانون کی پابندی نہ وہاں کسی آئین و دستور کا التزام۔ یہاں بھی ہر بات فرمانروا کی مرضی پر موقوف، وہاں بھی ہر فیصلہ خدا کی مرضی کے ماتحت یہ مرضی یہاں لحظہ لحظہ بدلتی رہتی ہے، وہ مرضی وہاں لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہاں بھی کامیابی کے لئے بادشاہ کی خوشنودی مطلوب، وہاں بھی حصولِ مقصد کے لئے خدا کی خوشنودی درکار۔ اور خوشنودی کے حصول کا طریقہ، جذباتی اپیل۔ اس کے بعد دیکھئے کہ جس قسم کا بادشاہ کے دربار کا نقشہ یہاں سامنے آتا ہے اسی قسم کا تصورِ بارگاہِ خداوندی کا ذہنوں میں منقوش ہے۔ جب بھی کسی پر کوئی

دربارِ خداوندی کا نقشہ

مصیبت پڑتی ہے تو وہ یہ دیکھنے کے بجائے کہ میں نے خدا کے کس قانون کی خلاف ورزی کی ہے جس کا نتیجہ یہ نقصان ہے، کسی حضرت صاحب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے تاکہ اُن کی وساطت سے خدا تک اپنی فریاد پہنچائے۔ حضرت صاحب کے حضور درخواست پیش کی جاتی ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اگر تمہارا کام بن گیا تو خدا کے نام پر کیا دو گے۔ جب سودا طے ہو جاتا ہے، تو حضرت صاحب، رات کو خدا کی بارگاہ میں پہنچ کر اس کی درخواست پر حکم لکھوا لاتے ہیں۔ چنانچہ آج کل یہ کاروبار اتنا عام ہو گیا ہے کہ ہر خلافِ قانون اقدام کے لئے جہاں افسرِ متعلقہ تک پہنچنے کی سفارش ڈھونڈی جاتی ہے، وہاں خدا تک سفارش پہنچانے کے لئے کسی زندہ یا مردہ حضرت صاحب کا سہارا تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جہاں اُس افسر کو ہزار روپیہ رشوت کا دیا جاتا ہے وہاں حضرت صاحب کے ارشاد کے مطابق، پانچ سو روپیہ کی "خدا کی نیاز" دی جاتی ہے۔

قیامت میں عدل

قانون والے خدا نے، قیامت کا تصور ایسا دیا تھا جس میں نہ کسی کی سفارش چل سکے گی۔ نہ فرمائش۔ نہ فدیہ دے کر چھٹکارا ہو گا نہ کفارہ دے کر۔ وہاں کامل قانون کی کارفرمائی ہو گی۔ لیکن جب خدا کے قانون کی جگہ لاقانونیت کا تصور عام ہو گیا تو قیامت کا نقشہ بھی بدل گیا۔ سینٹ پال نے کہا تھا کہ تم اعمال کے ذریعے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں بھی اسی قسم کی روایات وضع کر لی گئی ہیں کہ

گنہگاروں کی بخشش

لَنْ يَّدْخُلَ اَحَدُكُمُ الْجَنَّةَ بِعَمَلِهٖ — کوئی شخص اپنے اعمال کی رُو سے جنت میں نہیں جائے گا۔ جنت رسول اللہؐ کی شفاعت سے مل سکے گی۔ پھر حضورؐ کی شفاعت کے سلسلہ میں عجیب و غریب قسم کی روایات وضع کی گئیں۔ مثلاً مشکوٰۃ شریف میں (بخاری اور مسلم کے

حوالے سے) یہ روایت درج ہے کہ قیامت میں جب گنہگار تمام انبیائے کرامؑ سے مایوس ہو جائیں گے تو رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ حضورؐ ان سے فرمائیں گے کہ

میں شفاعت کا اہل ہوں (اور تمہاری سفارش کروں گا)۔ پھر میں خداوند تعالیٰ کے حضور میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا خداوند تعالیٰ مجھ کو اجازت مرحمت فرمائے گا۔ اور میرے دل میں اپنی حمد و ثناء کے الفاظ ڈالے گا کہ میں ان الفاظ سے خدا کی حمد و ثنا کروں گا (وہ الفاظ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہیں) میں ان الفاظ سے خدا کی حمد و ثنا کروں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھ سے کہا جائے گا۔ محمدؐ! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے میں سنوں گا۔ مانگ جو کچھ مانگنا چاہتا ہے دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا اے پروردگار! میری اُمت کو بخش دے پروردگار! میری اُمت کو بخش دے۔ خداوند تعالیٰ فرمائے گا جاؤ اور دوزخ سے ان لوگوں کو نکال لو جن کے دل میں جو برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا۔ اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اور اس کے بعد درگاہ رب العزت میں دوبارہ حاضر ہوں گا اور خدا کی حمد و ثناء انہی الفاظ میں کروں گا اور پھر سجدہ میں گر پڑوں گا کہا جائے گا۔ اے محمدؐ! اپنا سر اٹھا۔ کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا پروردگار! میں اپنی اُمت کی شفاعت کرتا ہوں۔ میں اپنی امت کی شفاعت کرتا ہوں۔ کہا جائے گا کہ جاؤ اور جس شخص کے دل میں ذرہ برابر یا رائی کی برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو۔ چنانچہ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کروں گا اس کے بعد پھر حضور رب العزت میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا اور خدا کے حضور میں حاضر ہو کر انہیں الفاظ میں خدا کی حمد و ثنا کروں گا اور پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمدؐ! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ سنا جائے گا۔ مانگ۔ جو مانگنا چاہتا ہے۔ دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا۔ پروردگار میری اُمت۔ میری اُمت (یعنی میری اُمت کو بخش دے) کہا جائے گا جاؤ۔ اور جس شخص کے دل میں رائی کے چھوٹے سے چھوٹے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو۔ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد چوتھی مرتبہ پھر درگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور انہیں الفاظ میں حمد و ثنا کروں گا پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمدؐ! اپنا سر اٹھا کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔ مانگ دیا جائے گا۔ شفاعت کر قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا۔ اے پروردگار! ان لوگوں کو دوزخ سے نکالنے کی اجازت مرحمت فرما جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو (اور کوئی عمل نہ کیا ہو) خداوند تعالیٰ فرمائے گا۔ ان لوگوں کی سفارش تیرا حق نہیں ہے۔ قسم ہے اپنی عزت کی۔ اپنے جلال کی اور اپنی ذاتی اور صفاتی عظمت اور بزرگی کی میں ہی ان لوگوں کو دوزخ سے باہر نکالوں گا۔ جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ۔ کہا ہو گا۔ (بخاری و مسلم)

(مشکوٰۃ اردو ترجمہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۱۵ ۔ ۳۱۶)

اور یہ کچھ برادرانِ عزیز! اس رسولؐ کے متعلق کہا جا رہا ہے جس نے (قرآن کی زبان میں) یہ اعلان کر دیا تھا کہ اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی پاداش سے بچ نہیں سکتا۔ غور کیجئے کہ جو شخص اپنے جرم و خطا

کی پاداش سے بھی نہیں بچ سکتا کیا وہ دوسرے مجرموں اور خطاکاروں کو اپنی سفارش سے پاداشِ عمل سے بچا سکتا ہے؟

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد خدا ان لوگوں کو بھی دوزخ سے نکال دے گا جنہوں نے کوئی بھلائی نہیں کی ہو گی ان کی گردنوں میں نشانیاں اور مہریں ہوں گی جن سے یہ ظاہر ہو گا کہ انہیں کسی نیک عمل کے سبب نہیں بخشا گیا۔ (مشکوٰۃ۔ جلد دوم صفحہ ۳۱۸)

ایک اور روایت صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ دوزخ سے چار آدمیوں کو نکال دیا جائے گا اور خدا کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اور انہیں دوبارہ دوزخ میں بھیج دیئے جانے کا حکم دے دیا جائے گا۔ ان میں سے ایک مڑ کر دیکھے گا اور خدا سے عرض کرے گا۔ اے پروردگار! میں تو یہ اُمید رکھتا تھا کہ جب تو مجھے دوزخ سے نکال لے گا تو دوبارہ وہاں نہیں بھیجے گا۔ یہ کہہ کر رسول اللہ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ اسے دوزخ سے نجات دے دے گا۔

(مشکوٰۃ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۲۲)

یہ اُس خدا کا عمل بتایا جاتا ہے جس نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ حالانکہ تم ان جاں گداز مراحل سے نہیں گزرے جن سے اُممِ سابقہ کو گزرنا پڑا تھا۔ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ ان کی حالت یہ تھی کہ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر

جنت یونہی نہیں مل سکتی لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ بارالٰہا! تیرے قانون کے مطابق حق کی کامیابی کا وقت کب آئے گا۔ . . . ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد وہ جنت کے مستحق قرار پائے تھے۔ اسی طرح تمہیں بھی اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنانا پڑے گا۔ محض اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، تم چھوٹ نہیں سکو گے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (۲۹/۲)۔ جنت "بخشش" سے نہیں ملا کرتی۔ اسے خونِ جگر کی قیمت ادا کر کے خریدنا پڑتا ہے۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست

قرآن کریم کی ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایات، جن میں اعمال کے بغیر جنت کی ضمانت دلائی گئی ہے کبھی رسول اللہ کی نہیں ہو سکتیں۔ یہ اس دور میں وضع کی گئی تھیں جب معاشرہ میں لاقانونیت پھیل چکی تھی اور مجرم سفارشوں سے چھوٹ جایا کرتے تھے یا بادشاہ سلامت کے من کی موج سے۔

اولیاء کی طرف سے بخشش یہ تو خیر پھر بھی خدا اور اس کے رسولؐ کی باتیں تھیں، اپنے مریدوں کو جنت میں لے جانے کے متعلق مرشدانِ طریقت کے انداز اور بھی دلچسپ ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ملفوظات (دلیل العارفین) میں لکھا ہے کہ

بروزِ قیامت۔ انبیاء۔ اولیاء سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ان کے کندھوں پر کمبل پڑے ہوں گے۔

ہر ایک کمبل میں کم و بیش ایک لاکھ تانے کے تاگے اور ایک لاکھ بانے کے ہوں گے۔ ان کے مرید اور پیچھے ان کے ان تاگوں کو پکڑ لیں گے اور اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامہ محشر سے فارغ نہ نہ ہو۔ پھر حق تعالیٰ انہیں پل صراط پر پہنچائے گا اور وہ مع اپنے پیروں کے اس تیس ہزار برس کے راستے کو ایک دم زدن میں، بہ برکت چمٹے رہنے اس گلیم کے طے کریں گے۔ اور درِ دانہ بہشت پر پہنچ کر (اس گلیم کے ساتھ چمٹے رہنے کی وجہ سے) دارالنعیم میں داخل ہو جائیں گے۔

آپ ان روایات اور حکایات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ جس قوم میں اس قسم کے خیالات اور نظریات عام کر دیئے جائیں اس قوم میں قانون کا کوئی احترام اور نیک کام کرنے کے لئے کوئی جذبہ باقی رہ سکتا ہے؟ جب حالت یہ ہو کہ ہر قسم کے

ضرور گناہ کرو

مجرم، دھڑا دھڑ جنت میں داخل ہوتے چلے جائیں تو جرائم سے اجتناب کی ضرورت کسے لاحق ہو سکتی ہے۔ جرائم سے اجتناب تو ایک طرف ہمارے ہاں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا لے اور تمہاری جگہ دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلب گاری کرے۔ (مسلم۔ ترجمان القرآن۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۹)

یہ حدیث، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر، ترجمان القرآن میں درج کی ہے۔ اسے درج کرنے کے بعد وہ بڑے فخر سے لکھتے ہیں کہ "پس فی الحقیقت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم میں اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا معیارِ احکام ایک ہی ہے"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ تعلیم حضرت مسیح علیہ السلام کی ہے اور نہ یہ قرآنِ کریم کی۔ وہ یہودی الاصل، سینٹ پال کی اختراع ہے اور یہ مجوسی الاصل بھٹکے راویوں کی سازش۔ عیسائیوں نے تو اس تباہ کن تعلیم سے اس طرح پیچھا چھڑا لیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ کر کے، گناہ اور جرم میں فرق کر لیا۔

اس کا نتیجہ

انہوں نے پادریوں سے کہہ دیا کہ وہ لوگوں سے ان کے گناہوں کا اقرار (CONFESSION) لے کر معافی نامے بیچتے رہیں۔ مجرموں کا معاملہ دنیاوی عدالت کی رو سے طے پائے گا جہاں قانون کی کارفرمائی ہوتی۔ لیکن سوچئے کہ جس قوم کا نظریۂ زندگی یہ ہو کہ مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں۔ اور مذہب میں ان کا عقیدہ یہ ہو کہ اگر گناہ نہ کئے جائیں تو خدا انہیں مٹا کر ان کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا، تو ان کی سیاست کا کیا رنگ ہوگا؟ وہی رنگ جسے ہر جگہ بکھرا اور ابھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ یعنی اس میں لاقانونیت معاشرہ کی عام روش قرار پا جاتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے ایسے طریقے اختیار نہ کئے جو قانون کے خلاف جاتے ہوں تو اس کی جگہ کوئی دوسرا لے لے گا کیونکہ ان کے خدا نے (معاذ اللہ) کہہ رکھا ہے کہ اگر تم جرائم کا ارتکاب نہ کرو گے تو وہ تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے گا۔ آپ سوچئے کہ جس قوم کے یہ عقائد ہوں اور وہ ان عقائد میں ہزار سال سے ڈوبی چلی آ رہی ہو، اس میں قانون کا احترام اور اس کی پابندی کا جذبہ کسی طرح بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ چیزیں قوم کے تحت الشعور میں جا گزیں ہو چکی ہیں اور جب تک یہ وہاں سے نہیں نکلیں گی، قوم میں قانون پر چلنے کی عادت پیدا ہو ہی نہیں سکے گی۔ ایک طرف آپ قوم سے کہتے ہیں کہ جرائم کا مرتکب ہونا بری بات ہے۔ دوسری طرف ان کا خدا (معاذ اللہ) ان سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم جرائم کے مرتکب نہ ہوئے تو تمہیں مٹا دیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ان کا رسولؐ (پناہ بخدا) یہ جرأت دلا رہا ہے کہ تم جرائم سے مت

گھبراؤ نہیں تم سب کو، ایک ایک کر کے، دوزخ سے نکال کر جنت میں لے جاؤں گا۔ اور پیر صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرتے جاؤ۔ بس تم میری گدڑی کے تاگے کے ساتھ چمٹ جانا۔ کیا مجال جو رضوان کو پتہ تک بھی لگ جائے کہ تم سمگل کر کے جنت میں پہنچائے جا رہے ہو ــــ اس کے بعد فرمائیے کہ قوم آپ کے کہنے پر عمل کرے گی یا خدا اور رسول اور مرشدِ طریقت کی بات مانے گی۔؟

مغفرت اور شفاعت کا صحیح مفہوم

واضح رہے کہ "خدا کی بخشش" کے بجائے قرآن کریم کی صحیح اصطلاح "مغفرت" ہے جس کے معنی حفاظت کے ہیں۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی خطا ہو گئی ہے تو وہ اس سے توبہ کر کے اپنی روش میں تبدیلی کرے اور اس کے بعد ایسے اچھے کام کرے کہ ان کے خوشگوار نتائج سے، اُس خطا کے نقصان رساں نتیجہ سے حفاظت کا سامان مل جائے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴)۔ خدا کا ارشاد ہے۔ یعنی نیک کاموں کے خوشگوار نتائج سے بُرے کاموں کے تباہ کن اثرات مٹ جاتے ہیں۔ یہ ہے مغفرت جو خدا کے قانون کی رُو سے حاصل ہوتی ہے۔

شفاعت کے معنی ہیں کسی کا کسی دوسرے کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا، جیسے کسی فرد کا کسی جماعت کے ساتھ شامل ہو کر ان کے پروگرام کی تکمیل میں ان کا ساتھ دینا۔ دنیاوی امور میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کے ساتھ تعاون کرنا۔ اس کی امداد کے لئے کھڑے ہو جانا۔ اور نظامِ عدل میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کے حق میں سچی شہادت دینا ــ سفارش سے کسی مجرم کو چھڑوا دینے کا تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس سے قرآن کے قانونِ مکافات کی ساری عمارت نیچے آ گرتی ہے۔

قوموں کی زندگی پر ان کے معتقدات کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے جب تک آپ ان غلط معتقدات کو نہیں بدلتے، قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) کا ارشادِ خداوندی اس کی محکم دلیل ہے۔ یاد رکھئے! معاشرہ کی عمارت خدا کے تصور کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے جب تک آپ اس تصور کو قرآنی خطوط پر متشکل نہیں کرتے۔ معاشرہ میں اصلاح کی صورت پیدا ہو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ جس قسم کا خدا کا تصور اسی قسم کا معاشرہ۔ یہ ہے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا اصل الاصول۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہو گا کہ خدا پر ایمان کے معنی کیا ہیں اور یہ ایمان کس طرح انسانی اعمال کی بنیاد قرار پاتا ہے۔ ہمیں پہلے قرآن کریم کی روشنی میں خدا کا صحیح تصور قائم کرنا چاہیئے اور وہ صحیح تصور ہے، ایسا خدا جس کے ہاں قانون کی حکومت کارفرما ہے) اور پھر اس تصور کے مطابق خدا پر ایمان لانا چاہیئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن نے خود مسلمانوں سے بھی خدا پر از سرِ نو ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے ــــ خدا پر ہی نہیں بلکہ اس کے رسول اور کتاب پر بھی از سرِ نو ایمان لانے کا مطالبہ ــــ اس نے کہا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (۴/۱۳۶)۔ "اے مسلمانو! تم ایمان لاؤ خدا پر۔ اس کے رسول پر۔ اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی۔ اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔"

اس ایمان کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہمارے معاشرہ میں کس طرح "قانون کی حکومت" کارفرما نہیں ہوتی!

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے

طلوعِ اسلام نے قریب چالیس سال پہلے اس حقیقت کو قوم کے سامنے پیش کیا کہ اسلام میں غلط اور صحیح کا معیار خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے مروجہ عقائد اور مسالک کو اس معیار پر پرکھیں۔ جو اس پر پورے اتریں انہیں اسلامی قرار دیا جائے۔ جو اس کے خلاف جائیں انہیں مسترد کر دیا جائے۔ اس طرح ہم اس دین کا احیاء کر سکیں گے جسے اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم نے بہت سے ایسے عقائد اور شعائر کی نشاندہی کی جو قرآن مجید کے خلاف تھے۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ نے اس اصول کی شدت سے مخالفت کی اور طلوعِ اسلام کے خلاف کفر تک کے فتوے لگا دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں توفیق عطا فرمائی کہ ہم مخالفوں کے اس ہجوم سے متاثر ہوئے بغیر، قرآنی تعلیم کو عام کرتے رہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب یہ طبقہ آہستہ آہستہ قرآن مجید کی طرف آ رہا ہے۔ اس کی تازہ مثال ہمیں، جماعت اہل حدیث کے ترجمان ماہنامہ محدث (لاہور) کی اشاعت بابت محرم الحرام ۱۴۰۰ھ سے ملتی ہے جسے ہم بمسرت پیش خدمت قارئین کرتے ہیں۔

(۱) اسلام اور فرقہ بندی

طلوعِ اسلام نے اس حقیقت کو پیش کیا تھا کہ امتِ مسلمہ ایک غیر منقسم وحدت ہے جس میں الگ الگ فرقوں یا پارٹیوں کا وجود خلاف اسلام ہے۔ قرآن مجید نے اس تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے۔ اس پر قدامت پرست طبقہ کی طرف سے مخالفت کا طوفان برپا کر دیا گیا۔ لیکن دیکھئے کہ اب یہ حضرات کس طرح اعترافِ حقیقت پر مجبور ہو رہے ہیں۔ محدث کے محولہ بالا پرچہ کے اداریہ میں لکھا ہے :-

"پاکستان نظریاتی لحاظ سے ایک اسلامی مملکت ہے۔ آیئے اب دیکھیں کہ ایسی صورتِ حال میں اسلام ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے کسی معاشرہ کے صرف دو ہی فرقے یا پارٹیاں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کی نازل کردہ شریعت پر ایمان رکھتی ہے اور اسے دستورِ حیات بنانا چاہتی ہے اور اس میں سرگرم عمل ہے۔ قرآن کریم نے اس پارٹی کا نام "حزبُ اللہ" تجویز کیا ہے۔ "حزب" کا لفظ سیاسی پارٹی کے لئے مخصوص ہے۔ قرآن کریم نے حزب اللہ کی یہ تعریف فرمائی ہے :-

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵۸/۲۲)

"اے پیغمبرؐ! آپ ایسی قوم (کوئی) نہ پائیں گے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان بھی رکھتی ہو پھر ایسے لوگوں سے

دوستی بھی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔"

یعنی یہ اللہ کی پارٹی نہ تو لادین جماعتوں کے ساتھ الحاق کر سکتی ہے اور نہ اسلام کے علاوہ دوسرے نظریات و احکام کو قبول کر سکتی ہے۔ اس جماعت کی چند دوسری صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا :-

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲)

"یہی لوگ اللہ کی جماعت ہیں۔ آگاہ رہو یہی اللہ کی جماعت فلاح پائے گی۔"

اس کے مقابل دوسری وہ پارٹی ہے جو اسلامی نظامِ حیات کو پسند نہیں کرتی خواہ وہ نام کی مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی دشمنِ اسلام یا دین بیزار جماعت کو قرآن کریم نے "حزب الشیطان" کا نام دیا ہے۔ ارشادِ باری ہے :-

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۵۸/۱۹)

"ان پر شیطان نے اپنی گرفت مضبوط کر رکھی ہے اور انہیں خدا کی یاد سے غافل کر رکھا ہے یہ لوگ "شیطان کی پارٹی" ہیں آگاہ رہو یہ شیطانی جماعت ہی گھاٹے میں رہے گی۔"

دیکھیے آیاتِ بالا سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں :-

(۱) حزب اللہ صرف ایک ہی پارٹی ہو سکتی ہے، جب کہ حزب الشیطان بہت سی جماعتیں ہو سکتی ہیں کیونکہ حق کا یا سیدھا راستہ صرف ایک ہو سکتا ہے اور باطل کی راہیں لاتعداد ہو سکتی ہیں۔

(۲) اسلام کے خلاف باطل نظریات کی حامل پارٹیاں عموماً مشترکہ محاذ بنا لیتی ہیں اور اس کے مٹانے کے درپے رہتی ہیں۔ جیسا کہ حضور اکرمؐ کے زمانہ میں بھی ہوا کہ جنگِ خندق کے موقعہ پر اسلام کے مخالف تمام قبائل چڑھ آئے تھے۔ قرآن کریم نے انہیں احزاب کے نام سے پکارا ہے اور علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

(۳) ایک اسلامی مملکت میں شیطانی جماعت کا رو بارِ مملکت میں حصہ نہیں لے سکتی گویا اسلام یک جماعتی حکومت (ONE PARTY GOVERNMENT) کا حامی ہے۔ اس طرح سیاسی پارٹیوں کی از خود تحدید ہو جاتی ہے۔

اس بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام اتحاد اور یک جہتی کا قائل ہے۔ قرآن حکیم کا واضح حکم ہے :-

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران) (۱۰۳/۳)

("اے مسلمانو!) سب مل کر اللہ کی رسی (احکامِ شریعت) کو مضبوط تھامے رکھو اور فرقے فرقے نہ ہو جاؤ۔"

اس آیتِ جلیلہ کی رو سے اسلام میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل بالکل ناجائز بلکہ حرام ہے۔ کیا اس حکمِ خداوندی کی رُو سے یہ تمام سیاسی جماعتیں کالعدم قرار نہیں دی جا سکتیں؟

اسلام تفرقہ و انتشار کو شرک کے مترادف قرار دیتا ہے۔ ارشادِ باری ہے :-

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (۳۰/۳۱-۳۲)

"اور مشرکوں میں نہ ہونا (یعنی) ان لوگوں میں جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور خود فرقے فرقے ہو گئے۔"

فرقہ بازی کو شرک قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ کسی فرقہ کا وجود ہی اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب وہ اسلام کی عام تعلیمات سے ہٹ کر کچھ مخصوص نظریات کو اپنالے یا رسول کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی اپنا مقتدا تصوّر کرے۔ اور اسی چیز کا نام شرک ہے۔ پھر جس طرح مذہبی تفرقہ بازی ایک جرم عظیم ہے بعینہٖ سیاسی تفرقہ بازی بھی ایسا ہی جرم ہے کیونکہ اسلام میں سیاست بھی اسی کا ایک حصّہ ہے جس کے لئے مکمل ضابطہ موجود ہے۔ نتیجہ کے لحاظ سے بھی دونوں قسم کی تفرقہ بازی قوم کو ایک ہی جیسے ناخوشگوار حالات سے دوچار کر دیتی ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت میں سیاسی پارٹیوں کی بہتات کی کوئی وجہ جواز نہیں۔"

۲۔ خلیفۃ اللہ کا عقیدہ

طلوعِ اسلام نے یہ نظریہ بھی پیش کیا کہ ہم میں یہ عقیدہ جو عام چلا آرہا ہے کہ انسان خدا کا خلیفہ یا نائب ہے۔ یہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ انسان خدا کا عبد ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ یہ احکام خداوندی کی اطاعت کرے اور انہیں دنیا میں رائج کرے۔ طلوعِ اسلام کے اس نظریہ کی بھی سخت مخالفت ہوئی۔ لیکن دیکھئے کہ اب یہی حضرات کس طرح اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ مذکورِ صدر "محدّث" میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "مغربی جمہوریت"۔ اس میں صاحبِ مقالہ نے آیت "اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً" کے معنی دیئے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ (نائب، نمائندہ) قرار دیا"۔ مدیر محدّث نے اس عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے، حاشیہ میں لکھا ہے:-

انسان یا کوئی دیگر مخلوق اللہ کا خلیفہ نہیں بن سکتی کیونکہ خلافت کے معنی نیابت اور قائم مقام کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا اختیار کسی کو سونپا ہے اور نہ کسی کو قائم مقام بنایا ہے بلکہ صحیح حدیث کی رُو سے کبھی اللہ تعالیٰ انسانوں کے خلیفہ ہوتے ہیں۔ سفر کی مسنون دُعا میں ہے۔ اللّٰھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل (اے اللہ تو سفر کا ساتھی ہے اور گھر والوں میں خلیفہ ہے) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اسی موضوع پر اپنے طویل فتویٰ میں فرماتے ہیں" من اعتقد ان الانسان خلیفۃ اللہ فقد کفر" (جس نے انسان کے بارے میں خدا کا خلیفہ ہونے کا عقیدہ رکھا، وہ کافر ہوگیا۔ علامہ ماوردیؒ اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں جمہور سلف کے نزدیک ایسے شخص کو فاسق قرار دیتے ہیں۔ دراصل یہ فکر غالی صوفیاء کے عقائد سے درآمد ہے اور ہم اس کے مضمرات کی طرف توجہ کئے بغیر عموماً آیتِ مذکورہ میں بھی یہی معنی کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت میں خلیفۃ اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت ہے اور نہ آدم کا ذکر۔ بلکہ اس آیت میں زمین میں ایسی مخلوق کی آبادکاری کا ذکر ہے جن میں باہمی خلافت کا نظام قائم ہوگا۔

۳۔ بخاری کی ایک حدیث

احادیث کے صحیح ترین "مجموعہ" بخاری میں حسبِ ذیل حدیث درج ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا، برہنہ بدن بغیر ختنہ کے حشر کئے جاؤ گے اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیم ہیں۔ اور اس دن میرے چند صحابہ بائیں جانب (جہنم کی جانب) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا، یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ اللہ فرمائے گا، یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ بس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰ) نے کہا تھا۔ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۔ الی قوله العزیز۔

(بخاری عربی مطبوعہ مصر، جلد دوم، صفحہ ۱۴۵۔ اردو ترجمہ شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی۔ جلد دوم صفحہ ۱۳۹)

طلوعِ اسلام نے لکھا کہ یہ روایت (اور اسی قسم کی دیگر روایات) جن سے حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہو، وضعی ہیں اور دشمنانِ اسلام کی سازش کا نتیجہ۔ اس پر اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا گیا۔ اسے منکرِ حدیث قرار دیا گیا۔ (مولانا) محمد اسماعیل (مرحوم) (سابق) صدر جمعیت اہلِ حدیث نے یہاں تک لکھ دیا کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ طلوعِ اسلام نے کامل صبر و سکون سے اس مخالفت (اور کفر کے فتووں) کو برداشت کیا۔ لیکن اب دیکھئے کہ خود اہلحدیث حضرات کی طرف سے کس طرح اعترافِ حقیقت کیا جا رہا ہے۔ محولہ بالا ماہنامہ محدث نے لکھا ہے:-

> حضرت موسیٰ کے دو ساتھیوں کے سوا سب نے انہیں سرِ میدان دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں نے انہیں بیچ دیا۔ لیکن حضرت رسول اللہ (صلعم) کے صحابہؓ ایسے نہ تھے۔ اس لئے بدر کے میدان میں صحابہؓ نے حضرت رسول اللہ (صلعم) سے کہا کہ ہم حضرت موسیٰ کے ساتھیوں جیسے نہیں۔ صحابہؓ کا حضرت موسیٰؑ کے صحابہ پر طعن کرنا یہود کو کھا گیا۔ **چنانچہ انہوں نے مسلمانوں میں ایک گروہ پیدا کیا** جنہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت رسول اللہ (صلعم) کے صحابہؓ بھی آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد مرتد ہو گئے۔ نعوذ باللہ۔
>
> ... کاش مسلمان دشمنوں کی اس سازش کو سمجھتے۔ (صفحہ ۸۳-۸۲)

آپ دیکھتے ہیں کہ اس قسم کی احادیث کے متعلق اب کس طرح لفظاً لفظاً وہی کچھ کہا جا رہا ہے جو کچھ طلوعِ اسلام چالیس سال سے کہتا چلا آرہا ہے۔ اور ایسا کہنے والے کون ہیں؟ خود اہلِ حدیث حضرات! ہم مجلہ محدث کو اس اعترافِ حقیقت پر مستحق تبریک و تہنیت قرار دیتے ہیں۔

☆

۴۔ ہماری تاریخ

کتب احادیث میں وضعی روایات شامل ہونے کی ایک مثال ماہنامہ محدث کے حوالے سے آپ نے دیکھ لی۔ اب ایک مثال کتب تاریخ کے متعلق بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جماعت اہلِ حدیث ہی کے ایک دوسرے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) نے اپنی اشاعت بابت ۲۳ نومبر ۱۹۷۹ء میں تاریخ کے سلسلہ میں (مولانا) ابوالکلام

آزاد (مرحوم) کا ایک مقالہ درج کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :-

"افسوس ہے کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی تاریخ کا چہرہ، متأخرین کی نقاشیوں سے اپنے اصلی خال وخط کھو چکا ہے۔ ہر عہد کا مؤرخ دراصل اُسی عہد کی دماغی آب وہوا کا مخلوق ہوتا ہے، اس لئے سلف کے واقعات کی تصویر کھینچتے ہوئے اُسی رنگ وروغن سے کام لیتا ہے جو اُس کے عہد کی آب وہوا مہیا کر سکتی ہے۔ اسلام کی حقیقی اجتماعی زندگی کا اصلی دَور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد پر ختم ہو گیا، اور اُس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، اُس دور کی معنوی خصوصیات مفقود ہوتی گئیں۔ متاخرین اہلِ نظر وقلم کا زمانہ آیا تو یہ وہ وقت تھا، جب صدرِ اوّل کی دماغی آب وہوا کی جگہ بالکل ایک مختلف قسم کی فضا نشو ونما ہو چکی تھی، اس لئے ان مصنفوں نے جب اُس عہد کے حالات پر قلم اٹھایا، تو بجائے اس کے کہ اس عہد کا ذوق ومزاج پیدا کر کے اس کا مطالعہ کرتے، اپنے عہد کے پیدا شدہ ذوق کے رنگ میں اُس کی ہر بات رنگ ڈالی۔ تاریخ ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہر گوشہ تک اس معاملہ کے اثرات پہنچے۔ حتیٰ کہ فقہ واحکام تک کا گوشہ اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگر عہدِ صحابہ سے لے کر آخری عہدِ تدوینِ کتب تک کی کتابیں مسلسل موجود ہوتیں، اور صدیوں کی ترتیب کے ساتھ ان پر نظر ڈالی جا سکتی، تو صاف نظر آجاتا کہ صدرِ اوّل کے واقعات ومعاملات بعد کے ہر عہد میں نئے نئے لباس بدلتے آئے ہیں، اور ان کی تعبیر والفاظ کی جزئیات میں ہر عہد کی ذہنی خصوصیات کا پَرتو موجود ہے۔ مثلاً اگر تیرہ صدیوں کی تیرہ مسلسل تاریخیں موجود ہوتیں، تو تم اُنگلی رکھ کر بتلا سکتے۔ کہ صدرِ اوّل کے ایک ہی واقعہ نے اپنی جزئیات وصورت میں کس طرح تیرہ مختلف لباس بدلے ہیں"!

یہ ہے ہماری تاریخ کی حیثیت !

طلوعِ اسلام شروع سے کہتا چلا آرہا ہے کہ ہماری کتب احادیث اور تاریخ میں دشمنوں کی سازش سے بہت کچھ آمیزش ہوئی ہے۔ اسلام کو اس کی منزہ صورت میں پیش کرنے اور امت کے عقائد ومسالک کو از سرِ نو الدین کے مطابق قائم کرنے کے لئے اشد ضروری ہے کہ ان تمام کتب کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیا جائے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے صحیح تسلیم کیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے اور اس طرح کتبِ احادیث اور تاریخ کی از سرِ نو تدوین کی جائے۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ کا اب رجحان تو کچھ اس طرف ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ وہ اس ضرورت کو بالکلیہ تسلیم کر لیں۔ اس طرح دین اپنی حقیقی شکل میں نکھر کر سامنے آسکے گا۔

۵۔ طلاق کا مسئلہ

معاصر ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) کی ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے :-

روزنامہ "مشرق" لاہور کے بموجب کراچی کے ایک شخص نے سندھ ہائی کورٹ کے شریعت بنچ میں ایک درخواست دی ہے جس میں اس نقطے پر حتمی رولنگ دینے کی استدعا کی گئی ہے کہ کیا بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اس نے اپنی بھتیجی کا کیس پیش کیا جسے اس کے شوہر نے تین بار گواہوں کی موجودگی میں طلاق دے دی، جو اب عدت بھی پوری کر چکی ہے۔ درخواست دہندہ نے کہا کہ

اس نے حنفی مسلک کے چار مفتیوں سے رائے طلب کی تو انہوں نے کہا کہ طلاق مؤثر ہو چکی ہے جب اہل حدیث مفتیوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ طلاق کا عمل پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا ہے۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ اس صورت حال میں ایک عام مسلمان جو کسی خاص فرقے سے تعلق نہ رکھتا ہو، علماء کے متضاد فتووں میں سے کون سا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ شریعت بنچ نے درخواست سماعت کے لئے منظور کر لی ہے۔

("مشرق" لاہور - ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء)

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ملک میں عائلی قوانین رائج ہیں جن میں مسئلہ طلاق بھی شامل ہے، فقہی قوانین رائج نہیں۔ مذکورہ بالا خبر سے یہ واضح نہیں کہ درخواست دہندہ نے کون سے قانون کو شریعت بنچ میں چیلنج کیا ہے۔ جو الجھن اس نے بتائی ہے اس کا تعلق فقہی قوانین سے ہے، نہ کہ عائلی قوانین سے۔ اگر کراچی (سندھ) کے کوئی صاحب اس کے متعلق ہمیں مطلع فرما سکیں تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔

فقہ حنفی کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے تین دفعہ طلاق۔ طلاق۔ طلاق کا لفظ کہہ دے تو بیوی پر طلاق پڑ جاتی ہے (یعنی ان کا فسخ ہو جاتا ہے) اور اگر وہ شخص اپنے اس عمل پر نادم ہو اور اس بیوی سے دوبارہ رشتہ زوجیت استوار کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بیوی کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے خواہ ایک رات کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اس کا یہ نیا خاوند اسے طلاق دے۔ اس کے بعد وہ اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ اسے فقہ کی اصطلاح میں حلالہ کہتے ہیں۔

اہلِ حدیث حضرات اس کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک طلاق کا لفظ تین بار دہرانے سے تین طلاق نہیں پڑتیں۔ اسے ایک طلاق ہی شمار کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں جریدہ الاعتصام نے لکھا ہے:۔

"لیکن اگر نباہ کی کوئی صورت نہ بنے اور طلاق ضروری دینی پڑ جائے تو طلاق کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جس کی تلقین نہیں کی گئی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں۔ یعنی عورت ماہواری (حیض) سے بعد غسل کر کے جب پاک ہو جائے (جو طہر کی حالت کہلاتی ہے) تو اس میں ایک طلاق دے دی جائے۔ پھر دوسرے مہینے دوسرے طہر میں دوسری اور تیسرے مہینے تیسرے طہر میں تیسری طلاق دی جائے۔ جیسا کہ فقہائے احناف نے اسے طلاق احسن کہا ہے۔ اور اس کی دو قسمیں اور کی ہیں (۲) طلاق حسن اور تیسری طلاقِ بدعی۔ لیکن غور کیا جائے تو تین طہروں میں تین طلاقوں کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک مرتبہ ہی طہر کی حالت میں ایک طلاق دے دینا کافی ہے۔ یہ طلاق رجعی ہو گی اگر شوہر عدت (تین حیض یا تین ماہ بہ اختلاف حالات) کے اندر رجوع نہیں کرے گا تو طلاق اپنے آپ متحقق ہو جائے گی مزید طلاقیں دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس مسنون طریقۂ طلاق کا فائدہ یہ ہے کہ اگر رجوع کی کوئی صورت عدت گزرنے سے پہلے ہی بن گئی تو وہ اپنے قول یا عمل سے رجوع کرے گا اور اگر عدت گزرنے کے بعد دوبارہ اس کو گھر میں لانے کا احساس پیدا ہو گا تب بھی اس کے لئے یہ راستہ کھلا رہے گا کہ بکاحِ جدید اسے اپنی بیوی بنا سکتا ہے"۔

الاعتصام نے طلاق کا جو مسنون طریقہ بنایا ہے اس کی رو سے، ایک مرتبہ کی طلاق کے بعد، عدت کے دوران وہ میاں بیوی بلا تجدید نکاح میاں بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ اس طلاق کا ان کے رشتہ زوجیت پر کوئی اثر

نہیں پڑتا۔ اور عدّت گزر جانے کے بعد وہ ایسا تجدیدِ نکاح کی رو سے کر سکتے ہیں۔ الاعتصام نے بات یہیں ختم کر دی ہے۔ قرآن کریم کا یہ حکم نہیں کہ اگر ان میاں بیوی میں دوبارہ طلاق کی صورت پیدا ہو جائے تو ان کے لئے اسی طریق سے دوبارہ میاں بیوی بن جانے کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر انہوں نے تیسری مرتبہ ایسا کیا تو پھر اس کی گنجائش نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عورت کسی اور جگہ شادی کر لے، اور اس کے بعد اسے طلاق ہو جائے، تو پھر اپنے پہلے خاوند سے شادی کر سکتی ہے۔

لیکن فقہ حنفی ہو یا فقہ اہلِ حدیث، ان میں اور قرآنی قانون میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر خاوند کو اس کا حق دیتے ہیں کہ وہ جس وقت جی چاہے بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناچاقی پیدا ہو جائے تو ایک ثالثی بورڈ مقرر کیا جائے جو ان میں باہمی مصالحت کی کوشش کرے۔ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جائے تو فبہا۔ ورنہ ان دونوں میں طلاق واقعہ ہو جائے گی۔ یہ پہلی طلاق ہوگی۔ اس کے بعد کی صورت کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

عائلی قوانین میں طلاق کا یہی طریق بتایا گیا ہے۔ اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہی قانون اس وقت ملک میں رائج ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ سندھ شریعت بنچ اسی قانون کا جائزہ لے گی؟ ہمیں یہ معلوم کرنے کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی ہے کہ اس سے پہلے، پشاور کی شریعت بنچ، عائلی قوانین کی اس شق کو "خلافِ اسلام" قرار دے چکی ہے جس کی رو سے، (قرآن کے مطابق) یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے حصہ مل سکتا تھا۔ طلوعِ اسلام میں اس کے متعلق تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

مطالب الفرقان (جلد سوم)

مطالب الفرقان کی پہلی جلد اکتوبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری اکتوبر ۱۹۷۷ء میں۔ ارادہ تھا کہ آئندہ جلدیں اسی رفتار سے شائع کی جاتی رہیں گی۔ چنانچہ جلد سوم کا مسودہ ۱۹۷۸ء میں مکمل ہو گیا تھا لیکن کتابت اور طباعت کے راستے میں ایسی رکاوٹیں پیش آتی رہیں جن کی وجہ سے اس کی اشاعت میں صبر آزما حد تک تاخیر ہوتی چلی گئی۔ للہ الحمد کہ اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں اور کتاب چھپ کر آگئی ہے۔ یہ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۱۳ تا ۲۸۶ (اختتام سورۂ بقرہ) پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ چھتیس صفحات پر پھیلا ہوا تینوں جلدوں (یعنی سورۂ فاتحہ اور مکمل سورۂ بقرہ) کے مضامین کا انڈکس بھی شامل ہے۔ اس سے قرآن کریم کی نمایاں تعلیم بیک نظر سامنے آجاتی ہے۔ اس سلسلے میں کتاب کے عنوانات پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ (۱) والدین کے بنیادی اصول (۲) معاہد حرم (۳) مرکزِ ملت (کعبہ) (۴) رزمگاہِ حیات (۵) بیّنات اور کتاب (۶) آل ورلڈ مسلم کانفرنس (۷) دیمنِ خانہ (عائلی زندگی) اور (۸) قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل ۔۔ کتابت۔ طباعت۔ کاغذ۔ جلد میں سابقہ معیار برقرار رکھا گیا ہے، لیکن ضخامت اس کی پہلی دونوں جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یعنی قریب ساڑھے پانچ سو صفحات۔ اس لحاظ سے قیمت میں بھی کچھ اضافہ ناگزیر ہو گیا۔ یعنی -/۵٥ روپے فی جلد (علاوہ محصول ڈاک)۔

(ناظم ادارہ)

محترم پرویز صاحب کا
درسِ قرآن

لاہور میں ہر جمعہ ۹½ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰..)
۲۵/بی گلبرگ ۲ نزد پولیس اسٹیشن

کراچی میں ہر جمعہ کو ۱۰½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ
بزم طلوع اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۳ بارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان۔ آغا
محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی
مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ (فون ۳۶۵۹)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خان۔ نواب علی روڈ

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بی ۱۲۶۰ - لیاقت روڈ

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نماز مغرب
رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔ لیہ

بزم طلوع اسلام ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
لندن (انگلینڈ)
149 SETTON COURT RD
LONDON E-13 – 9NR.
PHONE 01 – 552 – 1517

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۲½ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
حیات سرجری کلینک ۲/23-E پیپلز کالونی I
(فون 27455)

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ
چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/بی جمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزم طلوع اسلام بازار کلاں

ملتان میں ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون ۳۱۰۷۱)

پنج کسّی میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام
(تحصیل کبیروالا ضلع ملتان) بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب
نمائندہ بزم طلوع اسلام

ضرورتِ رشتہ

ایک شریف الطبع۔ پاکیزہ اخلاق۔ ڈاکٹر (M-R-C-P) کے لئے جو نہایت معقول مشاہرہ پر ملازم ہے، تعلیم یافتہ، بلند خیال، کشادہ طبیعت، رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے۔ جو عند الضرورت خاوند کے ساتھ، بیرونِ پاکستان جانے کے لئے بھی آمادہ ہو۔ ذات پات یا جہیز کی کوئی پابندی نہیں۔ (خط وکتابت بصیغۂ راز)

(د۔ ڈ) معرفت۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور